یکم اگست ۲۰۱۷ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۰ ۔ شمارہ نمبر: ۱۵

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ ۔ ۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱ ۔ ۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطہ ءنظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

خلیجی بحران اور الجزیرہ

Zachary Laub

تعارف

سعودی عرب اور خلیجی ملکوں کے اتحاد نے رواں برس جون میں قطر سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے تھے، اب ان ملکوں نے سفارتی تعلقات کی بحالی اور پابندیاں اٹھانے کے لیے جو شرائط رکھی ہیں، ان میں سے ایک الجزیرہ چینل کو بند کرنا بھی شامل ہے۔ قطر نے دیگر مطالبات کے ساتھ اس مطالبے کو بھی یکسر مسترد کر دیا ہے۔ اس بڑے میڈیا ہاؤس نے قطر کو مشرق وسطیٰ اور اس سے باہر اپنا اثر رسوخ بڑھانے میں مدد دی ہے، یہ ہی نہیں، اس بڑے میڈیا ہاؤس نے چھوٹی سی خلیجی ریاست کو خلیج تعاون کونسل میں اپنے بڑے اتحادیوں کی خارجہ پالیسیوں کو پیچھے دھکیلنے اور اپنا راستہ خود متعین کرنے میں مدد دی ہے۔ اسی لیے قطر نے اپنی طاقت کے ایک ذریعے کو بند کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

قطر کے شاہی خاندان کے سرمائے نے الجزیرہ کو مارکیٹ کے دباؤ سے مکمل آزاد رکھا ہے۔ الجزیرہ نے ریاست کے حامی روایتی قسم کے میڈیا سینٹر کے متبادل کے طور پر پیش کیا، اس میڈیا ہاؤس کی جانب سے عوامی مزاحمتی تحریکوں کی رپورٹنگ بھی طاقتور ریاستوں کو ناگوار گزری۔ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر اور بحرین نے الجزیرہ پر دہشت گردی پر ابھارنے کا الزم لگایا لیکن الجزیرہ نے الزام کو مسترد کرتے ہوئے اسے خطے میں آزادی اظہار رائے کو خاموش کرانے کی کوشش قرار دیا۔

الجزیرہ کب وجود میں آیا؟

شیخ حمد بن خلیفہ الثانی نے اپنے والد کے خونی بغاوت میں معزول ہونے کے بعد ۱۹۹۶ء میں الجزیرہ کی بنیاد رکھی۔ شیخ حمد قطر کے ایران، اسرائیل اور حماس جیسے اسلامی گروپس کے ساتھ تعلقات قائم کر کے اپنے آپ کو سعودی عرب کے سائے سے نکالنا چاہتے تھے۔ شیخ حمد کا ماننا تھا کہ ٹی وی نیوز اپنے جرأت مندانہ پروگرامات اور تحقیقاتی صحافت کے ساتھ عرب ناظرین پر تیزی اور آزادی سے اپنے اثرات مرتب کرے گی، حکومتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قطر کا موقف عرب قوم کے گھروں تک پہنچے گا۔ ان کے صاحبزادے شیخ تمیم بن الثانی نے اس آزادانہ خارجہ پالیسی کو آگے بڑھایا۔

الجزیرہ کا آغاز سیٹلائٹ چینل کے طور پر ہوا، جو مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقا میں پھیلا ہوا تھا۔ جب سعودی عرب کی جانب سے اسٹیشن کو سیٹلائٹ ٹرانسمیشن سے ہٹایا گیا تو چینل نے بی بی سی کے عربی زبان کے چینل کے ملازمین کو ملازمت دے کر اپنے نیوز روم کی بنیاد رکھی۔ یونیورسٹی آف جنوبی کیلیفورنیا میں ابلاغ اور بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر جناب فلپ سیب کہتے ہیں کہ بی بی سی اور سی این این کی موجودگی میں اس چینل نے اپنی اعلیٰ پروڈکشن کے ساتھ الگ مقام بنایا ہے جس کی مثال خطے میں نہیں ملتی اور سب سے اہم بات کہ یہ عرب چینل ہے جو عرب ملکوں کے حالات حاضرہ کو پیش کر رہا ہے۔

مشن کیا ہے؟

الجزیرہ نے اپنی رپورٹنگ سے خطے کے دیگر ریاستی کنٹرولڈ چینلوں میں جگہ بنانے کی کوشش کی ہے، جس نے سرکاری بیانیے کو چیلنج کیا اور اپنی پروگراموں میں طرح طرح کے موقف کو پیش کیا۔ نیٹ ورک کی رپورٹنگ اکثر حکومتوں کے خلاف ہوتی تھی اور یہ اُن عوامی مسائل کو اجاگر کرتے تھے، جنہیں سرکاری میڈیا شاید ہی سامنے لاتا ہو۔ نیٹ ورک نے اسرائیل اور ایران کے موقف کو پیش کر کے عرب میڈیا کی روایت کو توڑا اور ساتھ ہی ساتھ یہودیوں اور شیعہ مخالف موقف کو بھی پیش کیا۔

مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقا میں الجزیرہ کی مقبولیت نے قطر کو اُس کی حیثیت اور رقبے سے کافی زیادہ اثر و رسوخ دیا۔ متحدہ عرب امارات سے بھی چھوٹے صرف دو لاکھ آبادی والے اس ملک کی واحد زمینی سرحد سعودی عرب سے ملتی ہے لیکن اس کے پاس دنیا میں قدرتی گیس کے سب سے زیادہ ذخائر ہیں (زیر زمین فیلڈ ہے جو ایران کے ساتھ ہے)، خلیج تعاون کونسل کے دیگر ملکوں کے مقابلے میں قطر کی جی ڈی پی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ قطر کے حکمران الثانی خاندان نے الجزیرہ کو بنانے میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے اور عالمی سیاست میں اپنے وزن سے زیادہ حصہ ڈالا۔ (الجزیرہ کا

اندرونی صفحات پر:۔

- سلامتی کی تنہا روش۔۔۔ پاکستان ہے اور بس۔۔۔ قائداعظم کا ایک تاریخی انٹرویو
- میں قاسم پاشا کا ہوں!
- کیا ایک مضبوط شخصیت ملک تبدیل کر سکتی ہے؟
- پاکستان: ٹرمپ کی ممکنہ پالیسی
- حزب اللہ کی شام میں شاندار کامیابیاں
- روبوٹس: سہولت یا مسئلہ؟

ہماری ویب گاہ دیکھیے: irak.pk

انحصار قطری حکومت پر ہے،۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۶ء کے درمیان گیس کی قیمتوں میں کمی آئی تو نیٹ ورک کو اپنے پانچ سو ملازمین کو فارغ کرنا پڑا۔)

اگرچہ الجزیرہ قطر کے حکمرانوں کے معاملات پر اس طرح نظر نہیں رکھتا، جس طرح دیگر حکومتوں پر رکھتا ہے لیکن پھر بھی یہ چینل قطر کی زبان نہیں بولتا۔ ماہرین کہتے ہیں کہ الجزیرہ نے خود کو سرکاری میڈیا کے متبادل کے طور پر پیش کیا اور قطری خارجہ پالیسی کے چند پہلوؤں کے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود اس نیٹ ورک نے عرب عوام میں اچھی شہرت کمائی ہے۔ عرب ممالک کے حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والے امریکی تجزیہ کار شبلی تہامی (Shibley Tehami) لکھتے ہیں کہ عرب عوام کی جانب سے الجزیرہ نے قطریوں کو امریکی اتحادی ہونے پر سخت تنقید سے بچایا جہاں کے اڈوں سے امریکی جہاز اڑتے اور عراق پر بم برساتے، ویسے عرب شہریوں کی جانب سے الجزیرہ کی پذیرائی اُن کی خواہشات کی عکاس ہے۔ یہ ہوائی اڈہ ان دنوں امریکی سینٹرل کمانڈ کا مرکز ہے اور یہیں سے طیارے شام اور عراق میں دولت اسلامیہ کے خلاف کارروائیاں کرنے کیلیے اڑان بھرتے ہیں۔

ناظرین کی تعداد

الجزیرہ کا کہنا ہے کہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں توسیع کے بعد اُس کی رسائی ایک سو سے زیادہ ملکوں میں ۳۱۰ ملین گھروں تک ہوگئی ہے۔ اس طرح الجزیرہ کا شمار سی این این اور بی بی سی جیسے اداروں میں ہونے لگا ہے۔ شبلی تہامی کے مطابق آس پاس کے ۲۲ ملکوں میں اس کی پہنچ ۳۵۰ ملین افراد تک ہے۔ خبروں کا معاملہ ہو تو دس برس کے دوران عربوں کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی کے لیے الجزیرہ پہلی یا دوسری ترجیح میں شامل ہوگیا ہے۔

سعودی شاہی خاندان نے اپنا نیوز نیٹ ورک ۲۰۰۳ء میں ''العربیہ'' کے نام سے دبئی میں قائم کیا۔ اس کی خبریں سعودی اور اماراتی مفادات کے قریب تر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ مصر کے صدر عبدالفتح السیسی کی کوریج الجزیرہ تنقیدی انداز میں کرتا ہے۔ یہ دونوں نیوز نیٹ ورک قریب ترین حریف سمجھے جاتے ہیں۔ فلپ سیب کا کہنا ہے الجزیرہ خطے کی نیوز کوریج میں اپنی برتری برقرار نہیں رکھتا تو اس کی وجہ مارکیٹ اور ٹیکنالوجی کے رجحانات ہوسکتے ہیں۔ انٹرنیٹ تک رسائی بڑھنے کے باعث کئی چھوٹے اداروں اور آزادئ صحافت کے معاملے میں قدرے بہتر سمجھے جانے والے ملکوں نے مقامی ٹی وی نیٹ ورکس قائم کرلیے ہیں، جو کئی سیاسی رجحانات کو مناسب جگہ دے رہے ہیں۔

الجزیرہ نے ۲۰۰۶ء میں انگریزی زبان میں اپنا نیٹ ورک قائم کرکے عالمی سطح پر رسائی حاصل کی، بے زبانوں کی آواز بننے کا عزم ظاہر کرکے اور کرہ ارض کے جنوبی حصوں کی جامع کوریج کے ذریعے الجزیرہ نے بی بی سی جیسے عالمی ادارے کو چیلنج کیا۔ الجزیرہ نے ۲۰۱۶ء میں دبئی میں اپنا ہیڈ کوارٹر ختم کیا اور دنیا بھر میں قائم ستر بیوروز میں ساڑھے چار ہزار ملازمین بھرتی کیے۔ الجزیرہ نے امریکی مارکیٹ تک رسائی کے لیے ۲۰۱۳ء میں الجزیرہ امریکا قائم کیا۔ اس کے تحت امریکا میں موجود ان طبقات پر توجہ دی گئی جنھیں دیگر ٹی وی چینلوں میں کم کوریج دی جاتی ہے۔ لیکن الجزیرہ کو کیبل کے ذریعے اپنی نشریات ناظرین تک پہنچانے کے لیے جدوجہد کا سامنا رہا، اس کے علاوہ بھی بعض مسائل کا اس نیٹ ورک کو سامنا رہا۔ امریکی نوجوانوں میں ویب سائٹ پر نیوز دیکھنے کے رجحان میں اضافہ ہوا تو الجزیرہ امریکا نے وہاں اپنی موجودگی یقینی بنائی اور کیبل پر دکھائے جانے والے ٹی وی چینلوں پر سبقت حاصل کرلی۔ پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں کمی کے بعد جو الجزیرہ کے مالکان کا اہم ذریعہ معاش ہے، اس نیٹ ورک نے تین سال سے بھی کم عرصے میں اپنا یہ مہنگا ترین آپریشن بند کردیا۔

خلیجی ریاستوں اور مصر کی ناراضی کی وجہ

الجزیرہ کی جس کوریج نے عربوں میں اس نیٹ ورک کو مقبول بنایا، اُسی کوریج کو کئی عرب حکومتوں نے اشتعال انگیز اور خطرناک قرار دیا۔ الجزیرہ کی کوریج کے باعث ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب اور قطر کے تعلقات کشیدہ ہوئے اور ریاض نے دوحا سے اپنا سفیر واپس بلالیا۔ قطر کی جانب سے الجزیرہ کی سعودی عرب سے متعلق پالیسی میں نرمی کی یقین دہانی پر سعودی حکومت نے پانچ برس بعد دوحا سے سفارتی تعلقات دوبارہ بحال کیے۔

سعودی عرب کی قیادت میں عرب اتحادیوں نے الزام لگایا ہے کہ الجزیرہ دہشت گردی کے لیے اکساتا ہے اور یہی اعتراضات کی بڑی وجہ ہے۔ اسی عرب اتحاد نے اخوان المسلمون کے مرکزی رہنما شیخ یوسف القرضاوی پر الزام لگایا کہ وہ اپنے ٹاک شوز میں پرتشدد کارروائیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ کئی ملکوں نے الجزیرہ نیٹ ورک کے صحافیوں کو اپنی سرحدی حدود میں کام سے روکنے یا اپنے عوام کو اس نیٹ ورک کے پروگرامات دیکھنے سے روکنے کی کوشش کی۔

خطے میں ۲۰۱۱ء کے عرب بہار کی کوریج بھی اس کشیدگی میں اضافے کی وجہ بنی۔ الجزیرہ نے اپنی کوریج میں خطے میں بدلتے حالات کا احاطہ کیا، حکومت مخالف افراد کی آواز بنا اور اُن کے خلاف پرتشدد کارروائیوں کو اپنی اسکرین پر جگہ دی۔ اس کوریج کے نتیجے میں احتجاج شدید ہوتا گیا اور خطے کے دیگر حصوں تک احتجاج کی یہ لہر پھیل گئی۔

مصر میں پہلے منتخب صدر محمد مرسی کی منتخب حکومت ختم کرکے جنرل فتح السیسی نے اقتدار حاصل کیا تو الجزیرہ پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ سیسی سمجھتے تھے کہ الجزیرہ کی رپورٹ کے باعث مصر میں جمہوریت اور خاص کر اخوان المسلمون کو فروغ مل رہا ہے۔ جنرل سیسی کے اقتدار میں آنے کے بعد پریس کے خلاف بڑا کریک ڈاؤن شروع کیا گیا۔ مصر میں الجزیرہ کی نشریات روک دی گئیں۔ صحافیوں کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈالا گیا اور بیورو بند کردیے گئے۔

بعض ماہرین سمجھتے ہیں کہ سعودی اتحاد کے حالیہ مطالبات کا تعلق دہشت گردی کے بجائے عرب بہار سے خطے میں حاصل جمہوری فوائد کو لپیٹ دینا ہے۔ امریکا کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے پیغام سے حوصلہ افزائی ملنے کے بعد اب خطے میں اس تبدیلی کے خلاف مربوط کوششیں کی جارہی ہیں۔

الجزیرہ کی بندش کے لیے دباؤ

قطر نے سعودی اتحاد کے مطالبات مسترد کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ دوحا الجزیرہ کی بندش کے مطالبے کو مذاکرات سے راہ فرار کا طریقہ سمجھتا ہے۔ میڈیا ناقدین کہتے ہیں کہ عرب بہار کے بارے میں الجزیرہ کی کوریج نے خطے میں قطر کی باضابطہ موجودگی کو ظاہر کیا۔ جن ملکوں میں مظاہرے اور احتجاج ہوا وہاں قطر نے پہلے مسلم اپوزیشن جماعتوں اور پھر جنگجو گروپس کی حمایت کی۔ قطر چاہتا تھا کہ اس طرح گروہوں کی حمایت کرکے نئے حالات میں وہ اپنی پوزیشن بہتر کرلے گا اور جواب میں دوحا کو بھی ان گروہوں کی حمایت حاصل ہوگی۔ لیکن سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک اخوان المسلمون اور اس جیسے سیاسی اسلامی گروہوں کو اپنے غیر جمہوری نظام کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ سعودی عرب کا شکوہ ہے کہ قطر نے ایسے گروہوں کی حمایت کرکے گزشتہ معاہدوں پر پانی بہادیا۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی اتحاد اور قطر کے درمیان مصالحت کے لیے امریکی وزیر خارجہ ریکس ٹلرسن کی کوششوں کے باوجود بات چیت میں تعطل برقرار ہے۔ (ترجمہ: معاذ احمد)

"How Al Jazeera amplifies Qatar's clout". ("cfr.org". July 12, 2017)

سلامتی کی تنہا روش... پاکستان ہے اور بس...

قائداعظم محمد علی جناح کا قیام پاکستان سے قبل ایک تاریخی انٹرویو

''الائیڈ نیوز پیپرز'' کے مشہور نامہ نگار میورلی نکسن نے ۱۹۴۴ء میں اپنے قیام ہندوستان کے تاثرات Verdict on India کے عنوان سے پیش کیے تھے، اس میں قائداعظم سے ایک تاریخی انٹرویو ہے، جس میں پاکستان کا کیس اس کے بہترین ایڈوکیٹ نے پیش کیا ہے، کتاب کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ پیش جارہا ہے۔

نکسن: (مسٹر جناح سے) آپ پر معترضین کا سب سے عام اعتراض یہ ہے کہ آپ نے پاکستان کی کوئی واضح اور جامع و مانع تعریف نہیں کی......علاوہ ازیں دفاع، معاشیات اور اقلیتوں کے حقوق وغیرہ کی بہت سی ایسی تفصیلات ہیں جنہیں آپ نے عمداً مبہم چھوڑ دیا ہے۔ کیا آپ کے نزدیک یہ الزام بجا ہے؟

جناح: یہ نہ تو بجا ہے اور نہ فہم وفراست کی کوئی دلیل ہے۔ خصوصاً جب کسی انگریز کی جانب سے ہو۔ جسے اپنی تاریخ کی کچھ خبر نہ ہو۔ جب آئرلینڈ انگلستان سے جدا کیا گیا تو تقسیم کی شرائط کی دستاویز صرف دس سطروں پر مشتمل تھی، صرف دس مطبوعہ سطریں......ایک ایسے ناقابل فہم اور پیچیدہ مسئلہ کے حل کے لیے جس نے صدیوں تک برطانوی ریاست کو زہر آلود کر رکھا تھا۔ ساری تفصیلات مستقبل پر چھوڑ دی گئی تھیں......مستقبل اکثر بہتر ثابت ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے میں نے تو دس سطروں سے کہیں زیادہ مواد پاکستان کے اصول اور عملی ہیئت کو ظاہر کرنے کے لیے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ کسی آدمی کے بس کی بات نہیں کہ ساری جزئیات وتفصیلات کو بھی قطعی طور پر فیصلے کی صورت میں پیش کردے۔

علاوہ ازیں ہندوستان کی تاریخ بھی ثابت کرتی ہے کہ کوئی ایسی تفصیلی دستاویز غیرضروری اور لاحاصل ہے۔ گول میز کانفرنس میں جب برما کی علیحدگی کا مسئلہ طے ہوا تو کیا کوئی دستاویز مرتب ہوئی تھی! ہے کوئی دستاویز جب سندھ بمبئی سے علیحدہ کیا گیا؟ جواب ظاہر ہے کہ قطعی نفی میں ہے۔ کیونکہ ایسی دستاویز کا کہیں وجود نہیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔

اصل تنقیح یہ تھی کہ علیحدگی کا اصول تسلیم کرلیا جائے۔ تفصیلات طبعاً ظہور میں آجائیں گی۔

نکسن: آپ پاکستان کے بنیادی اصول کی کس طرح تعبیر فرمائیں گے؟

جناح: صرف چار لفظوں میں۔ مسلمان ایک قوم ہے۔ اگر یہ آپ تسلیم کرلیں اور آپ صاحبِ دیانت ہوں، تو آپ پاکستان کے اصول کو مان لیں گے۔ اگر موانعات ومشکلات موجودہ صورت سے سوگنا بھی زیادہ ہوئے تب بھی آپ اس اصول کو ماننے پر مجبور تھے۔

ہاں اگر آپ ماننا ہی نہ چاہتے ہوں......انکار کی دل میں ٹھان لی ہو......تو یہ اور بات ہے......شانوں کو حرکت دیتے ہوئے مسکرادیے۔

نکسن: آپ مسلمانوں کو ایک قوم کن وجوہ کی بناء پر کہتے ہیں، کیا آپ کے نزدیک مذہب کے اعتبار سے مسلمان ایک قوم ہے؟

جناح: ہاں! اس لیے بھی لیکن صرف مذہب ہی کی بنا پر نہیں۔ یاد رکھیے کہ اسلام صرف روحانی اور مذہبی اصول ہی نہیں، بلکہ ایک حقیقی عملی نظامِ حیات ہے۔ نہ صرف مذہب بلکہ میں تو زندگی پر ایک کل کی حیثیت سے غور کرتا ہوں اور سارے نظامِ حیات کے اعتبار سے مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم سمجھتا ہوں۔ زندگی کے ہر اہم شعبہ اور عنصر کے لحاظ سے، ہماری تاریخ کے لحاظ سے، ہمارے مشاہیر واکابر کے اعتبار سے، ہمارے آرٹ اور فن تعمیر کے لحاظ سے، ہماری موسیقی، ہمارے قوانین اور اصولِ قانون کے اعتبار سے غرض ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک ممتاز اور علیحدہ قوم ہیں۔

نکسن: کرم ہوگا اگر آپ مجھے ان چیزوں کو لکھنے کا موقع عنایت فرمائیں۔

جناح: (کسی قدر وقفہ کے بعد) ان تمام امور میں ہمارا زاویہ نگاہ نہ صرف ہندوؤں سے مختلف ہے بلکہ اکثر شعبوں میں بالکل متضاد ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری دنیا ہی مختلف ہے۔ زندگی میں ہمیں اس سے مربوط کرنے والی کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔ ہمارے نام، ہماری غذا، ہمارا لباس یہ سب مختلف ہیں۔ ہماری معاشی زندگی ہمارے تعلیمی تصورات، عورتوں کے ساتھ ہماری روش، حیوانات کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل ہر نقطہ میں ہر کام پر ہم دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ دور کیوں جائیں......گائے کے ایک دائمی قضیہ ہی کو لیجیے......ہم گائے کو ذبح کرتے ہیں اور کھاتے ہیں اور ہندو اسے پوجتے ہیں۔ شاید اکثر انگریز خیال کرتے ہوں گے کہ گئو پوجا صرف خوشنما رواج یا محض تاریخی یادگار ہے، حالانکہ حقیقتاً یہ چیز ایسی نہیں چند دن پہلے اسی شہر میں گائے کا معاملہ پولیس کے لیے ایک آفت بن گیا تھا۔ ہندو نہایت اشتعال میں تھے کہ گائیں منظر عام پر ذبح کی جارہی تھیں، لیکن گائے کا مسئلہ ان ہزاروں مابہ النزاع مسائل میں سے صرف ایک ہے......ذرا دم لے کر......اچھا تو آپ نے کیا لکھا ہے؟

نکسن: میں نے لکھا ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔

جناح: کیا آپ کو اس کا یقین ہے؟

نکسن: جی ہاں! مجھے اس کا یقین ہے۔

جناح: (تبسم آمیز لہجہ میں) آپ کے اور کیا سوال ہیں۔

نکسن: پہلا سوال معاشی ہے۔ کیا مسلمان پاکستان میں امیر تر ہوں گے یا غریب تر، کیا آپ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابل چنگی کے محاصل عائد کریں گے؟

جناح: میں ذرا تبدیلی کی خاطر ایک سوال کروں گا، فرض کیا جائے کہ کوئی آپ سے سوال کرے کہ آپ جرمنی کے تحت خوشحال انگلستان کو ترجیح دیں گے، یا غریب مگر آزاد انگلستان کو تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

نکسن: اس میں جواب کی کیا بات ہے؟

جناح: ہاں، بے شک! یقیناً یہی بات ہے...... پھر کیا آپ کا سوال بے جا نہیں معلوم ہوتا؟......یہ عظیم الشان نصب العین، شخصی آرام اور عارضی راحت کے سوالات سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے، مسلمان ذرا سخت جان قوم ہے اور سخت کوش بھی۔ اگر پاکستان کے یہ معنی ہیں انہیں کسی قدر اور سختی برداشت کرنی ہوگی، تو وہ اس کی پروا نہ کریں گے، انہیں اس کی کوئی شکایت نہ ہوگی، لیکن پاکستان غربت کے مترادف کیوں سمجھا جائے، وہ کون سا قابل قیاس سبب ہے جس کے باعث مستقل قومیت کا یہ تحفہ معاشی حد بندی اور محرومی کے ہم معنی قرار پائے......دس کروڑ کی ایک آزاد و خودمختار قوم......اگرچہ وہ فوراً ترقی نہ کرسکتی ہو یا صنعتی اعتبار سے کسی قدر پیچھے بھی ہو پھر بھی مشکل ہی سے بدتر معاشی موقف میں رہے گی۔ بمقابلہ اس کے کہ اس قوم کے افراد غیر منظم اور منتشر ہوں اور پچیس کروڑ ہندوؤں کے غلام رہیں۔ جن کا واحد مقصد ان کو اپنے ناجائز استحصال اور معاشی دستبرد کا شکار بنانا ہے۔ معاہدہ وارسا کے ہوتے ہوئے کسی یورپین کی کیا مجال ہے کہ پاکستان کو معاشی طور پر ناممکن حقیقت قرار دے۔ یہ میرے لیے ناقابل تصور ہے۔ وہ بڑے دماغ جنہوں نے یورپ کو غیر متجانس اور متخالف ومصنوعی حدود میں شامل کردیا وہ ہمارے معاملہ میں معاشیات کے عذر لنگ کا حق نہیں رکھتے۔ خصوصاً جبکہ ہمارا مسئلہ نہایت سیدھا سادا ہو، الجھنوں سے پاک۔

نکسن: کیا یہی اصول دفاع پر بھی صادق آتا ہے۔

جناح: بے شک اسی اصول کا دفاع پر بھی اطلاق ہوگا۔ میں یہاں پر پھر ایک سوال آپ سے کروں گا...... افغانستان کس طرح دفاع کا انتظام کرتا ہے؟ ہاں دیکھیے جواب کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ افغانی اس کے محافظ ہیں بالکل یہی جواب ہمارا بھی ہے۔ ہم ایک ہم آہنگ اور دلیر قوم ہیں جو نہ صرف محنت کے لیے تیار ہیں بلکہ ضرورت ہو تو جنگ پر بھی آمادہ ہیں۔ پھر آپ ہی بتایئے کہ دفاع کا سوال کیا پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ ہمارا مسئلہ دوسری قوموں سے کس باب میں مختلف ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عبوری دور بھی ہوگا ہم برطانوی قوم سے رات کے رات ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ نہیں کررہے ہیں، اہلِ برطانیہ ہی نے یہ گرہ پیدا کی ہے اور ان ہی کو اس سیاسی عقدہ کشائی میں بھی مدد کرنا چاہیے، لیکن اس کو حل کرنے کے لیے انہیں کافی غور وفکر کی ضرورت ہوگی۔ ہاں مجھے خیال آیا کہ اس مسئلہ میں مجھے آپ کو کچھ دکھانا ہے۔

مسٹر جناح عذرخواہی کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے اور میں سگریٹ سلگا کر محوِ انتظار رہا۔ یکا یک مجھے احساس ہوا کہ شاید کوئی اہم واقعہ ظہور میں آنے والا ہے یا یہ کہ شاید کچھ واقعہ ہو۔ میں آپے سے باہر نہ تھا، جناح برطانوی پالیسی پر نہایت شدید اور تلخ تنقید فرمارہے تھے (اگرچہ میں نے اس مکالمہ میں ان نقاطِ تنقید کو نقل نہیں کیا ہے لیکن بہرحال ان کی جرح اور تنقیح نہایت واضح تھی اور ان کے اخلاق و ذہن کا پتا دیتی تھی، بلکہ یوں کہیے کہ ان کے ذہن رسا پر صریح دلالت کرتی تھی۔ وہ صرف تلخ کلمات کی ترکیب نہ تھی اور نہ محض نفرت اور اشتعال کا کوئی معجون مرکب تھا جیسے ہندو طرزِ تنقید میں پایا جاتا ہے۔ یہ تنقید ایک تشخیص تھی، مسٹر جناح کی تنقید اور کسی ہندو سیاست دان کی تنقید میں ایک سرجن اور جادوگر کا سا فرق پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا فیصلہ نشتر تھا لیکن ایک سرجن، کا اہلِ برطانیہ کو اس کا احساس ہونا چاہیے کہ ان کا یہاں کوئی دوست نہیں ہے۔ یہ مسٹر جناح نے، مسئلہ پاکستان کے زیر بحث آنے سے پہلے فرمایا ’’قطعاً کوئی دوست نہیں‘‘۔ ایک ہندو مدبر ہوتا تو یہی بات گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا اور اور بڑی مسرت کا اظہار کرتا، جناح نے اسے نہایت خاموشی سے کہا اور کسی قدر افسوس کے ساتھ۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت ایک کتاب تھی۔

جناح: شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ انگریزوں کو نہایت غور وفکر سے اس موقع پر کام لینا چاہیے، یہ ایک عادت ہے جو شاید ان کی اپنی طبیعت سے سازگار نہیں۔ وہ لاپروائی اور بےفکری کو ترجیح دیتے ہیں وہ صرف انتظار کرنا چاہتے ہیں...... اس امید میں کہ آخر میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، ہاں جب کبھی یہ تکلیف گوارا کرتے ہیں تو پھر خوب تدبر سے کام لیتے ہیں اتنا جتنا کہ کسی قوم کے لیے ممکن ہوسکتا ہے...... ان میں ایک بہترین مفکر اور مدبر...... کم از کم ہندوستانی مسئلہ پر جہاں دیدہ جان برائٹ تھا، کیا آپ نے اس کی کوئی تقریر پڑھی ہے؟

نکسن: جب سے ترکِ مدرسہ کیا ہے میں نے اس کی کوئی تقریر نہیں پڑھی۔

جناح: اچھا ذرا اس پر ایک نظر کیجیے، حسن اتفاق سے اس پر کل ہی میری نظر پڑ گئی۔

انہوں نے کتاب میرے حوالے کی جو ایک پارینہ کتاب تھی ’’جان برائٹ کی تقاریر‘‘ جس صفحہ کو کھولا گیا تھا اس میں ایک تقریر تھی، ۴ جون ۱۸۵۸ء کی۔ اس میں سب سے بڑے فصیح البیان رکن دارالعوام کی تقریر کا اقتباس درج ذیل ہے۔

’’ہندوستان پر آخر کب تک انگلستان اپنی حکومت کی ٹھانے رہے گا؟ ہے کوئی جو اس سوال کا جواب دے؟ پچاس سال، سو سال یوں کہیے پانچ سو سال سہی، کوئی شخص جس میں سمجھ بوجھ کی کوئی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کا یقین کرسکتا ہے کہ اس قدر وسیع ملک اپنی بیس مختلف قوموں اور بیسیوں زبانوں کے ساتھ، مارے باندھے جبراً قہراً ایک سلطنت اور واحد مملکت کی صورت قائم رہے...... میں تو اس کو قطعی ناممکن تصور کرتا ہوں‘‘۔

میں نے یہ دیکھنے کے بعد کتاب انہیں واپس کردی۔

جناح: مسٹر برائٹ نے جو کچھ اس وقت کہا تھا آج بھی ایک حقیقت ہے۔ بلکہ آج زیادہ حق بجانب ہے اگرچہ آج زور بیس قوموں پر اس قدر نہیں دیا جارہا ہے جس قدر دو قوموں پر، یعنی ہندو اور مسلم! کیوں وہ حقیقت آج زیادہ واضح اور وزنی تر ہے، کیونکہ انقلابات زمانہ نے ہمیں متحد نہیں کیا...... اس لیے کہ مسلمان بیدار ہوگئے ہیں...... وہ صورتحال کو سمجھ گئے ہیں...... تلخ تجربات کے بعد انہیں اس کا خوب اندازہ ہوگیا ہے کہ ایک متحدہ ہندوستان میں ہندو ان کے ساتھ میں کیا سلوک کررہے ہیں۔

ایک وحدانی ہندوستان کے معنی ہندو غلبہ کے ہیں اس کے صرف یہی معنی ہیں اور بس۔ آپ کوئی مفہوم اسے پہنانا چاہیں تو وہ صرف ایک قوم ہوگا، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، وحدانی ہند ایک برطانوی کرشمہ ہے...... محض ایک انتظامی وحدت ہے، جس پر ایک سامراجی تلوار کے زور سے مسلط ہے بس یہ ہے وحدت ہند کی حقیقت...... اس کے علاوہ اس کا کسی اور واقعاتی صورت میں کوئی وجود نہیں۔

نکسن: عجیب! آپ کے حریف یہ کہتے ہیں کہ پاکستان خود ایک برطانوی کرشمہ ہے گویا یہ تفریق کرو اور حکومت چلاؤ کا ایک نیا اطلاق ہے جو برطانوی سیاست کاری پر دلالت کرتا ہے۔

جناح: (کسی قدر جوش کے ساتھ) جو شخص ایسا کہتا ہے وہ میری دیانتداری تو الگ رہی برطانوی ذہنیت کو بھی نہیں سمجھتا۔ برطانیہ کو ہندوستان میں جو چیز روکے ہوئے ہے وہ متحدہ ہندوستان کا یہی غلط تصور ہے، جس کا گاندھی بھی پرچار کرتے ہیں۔ متحدہ ہندوستان ایک برطانوی کرشمہ ہے میں اس کو مکرر بیان کرتا ہوں کہ یہ ایک بے اصل افسانہ ہے، اور وہ بھی نہایت خطرناک جو نہ ختم ہونے والی جنگ وجدل کا دروازہ کھولتا ہے۔ جب تک یہ جنگ وجدل جاری ہے برطانیہ کو اپنے قیام کے لیے بہانہ ہاتھ آتا رہے گا۔

نکسن: آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ ’’تقسیم کریں اور چل دیں‘‘۔

جناح: آپ نے اس کو بڑی خوبی سے بیان کیا۔

نکسن: کیا یہ برطانوی رائے دہندوں کے لیے نہایت تلخی کا باعث نہ ہوگا۔

جناح: (سچائی ہمیشہ تلخ معلوم ہوتی ہے) لیکن خاص طور پر یہ حق اس قدر تلخ کیوں ہے؟

نکسن: کیونکہ عام طور پر شائستہ اور اوسط طبقہ کے کھلے دل والے لوگ رائے دیتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ برطانیہ اپنے معاہدات کی تکمیل کرے اور ہندوستان کو اقتدار بخشے۔ انہوں نے کانگریسی نقطۂ نگاہ کے سوا کچھ نہ سنا مسلمانوں کا مغرب میں کوئی بھی ترجمان نہیں۔

جناح: (تلخ انداز میں) میں آپ کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں۔ ہندوؤں نے صحافت اور اشاعت کا بڑا زبردست انتظام کیا ہے کانگریس اور مہاسبھا کو بڑے بڑے سرمایہ داروں اور کاروباری اصحاب کی بڑی مالی امداد اور سرپرستی حاصل ہے اور ہم اس سے محروم ہیں۔

نکسن: اس کا نتیجہ یہ ہے کہ باہر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس ہندوستان کے ایک اور ناقابل تقسیم ہونے کے کردار سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتی۔ ان کا خیال یہ ہوگیا ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی کوشش غیر ذمہ دارانہ اور ایک رجعت پسندانہ گناہ ہے۔ باہر کی دنیا میں سنجیدگی سے یہ خیال ذہن نشین ہوگیا ہے، میں جانتا ہوں کہ ہمارے ہم وطن فریب میں مبتلا ہیں لیکن ایسی عمومیت جیسی کہ ہماری ہے، ایسے پیچیدہ معجون مرکب تنقیحات کے باب میں مغالطہ ہی میں مبتلا ہوسکتی ہے۔ جو کچھ انہوں نے سیکھا ہے وہی ہے کہ وسیع القلبی اور انصاف پسندی کا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو چھوڑ دیا جائے اور عنانِ حکومت حوالہ کردی جائے۔

جناح: آپ اتنا اضافہ اور فرمالیں کہ سلامتی کی تنہا روش...... پاکستان ہے اور بس......‘‘ (ترجمہ: خورشید احمد)

(بشکریہ: ’’چراغِ راہ‘‘ کراچی۔ دسمبر ۱۹۶۰ء)

میں قاسم پاشا کا ہوں!

سعود عثمانی

آیے! آج آپ کو ایک مزے دار کہانی سناتا ہوں۔ ایک رات کی کہانی۔ اور جو کہانی حقیقت بن کر گزر چکی ہو، اس کے مزیدار ہونے میں کیا شک ہے۔ اس وقت جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، یہ اس سے پورے ایک سال پہلے کا ذکر ہے۔

ترکی کے ساحلی تفریحی شہر ''مارمریز'' (Marmaris) پر ۱۵ جولائی ۲۰۱۶ء کا دن ختم ہونے کو تھا اور ۱۶ جولائی کے آغاز میں کچھ دیر تھی۔

نیم خنک ہوا کی رفاقت میں ایک پرسکون رات اتر رہی تھی۔ ''بحیرہ ایجین'' (Aegean) کے گہرے نیلے پانی پہلے شفق کے سرخ اور نارنجی رنگوں میں رنگے گئے، پھر سرمئی چادر نے انہیں ڈھانپا اور بالآخر رات کا سیاہ رنگ ہر دوسرے رنگ کو بے دخل کر کے ان پر غالب آ گیا۔ استثناء صرف ساحلی عمارتوں کو تھا جہاں روشنیاں پوری آب وتاب سے موجود تھیں بلکہ گہرے سیاہ رنگ نے انہیں روشن تر کر دیا تھا۔

کچھ خوب صورت عمارتیں بہت ہی روشن تھیں۔ ''گرانڈ یازیجی ہوٹل (Grand yazici)، یازیجی کلب ہوٹل (yazici turban club)'' اور ملحقہ خوب صورت ولا (villa) انہی عمارتوں میں سے تھے۔ ترکی کا صدر، ۶۲ سالہ جواں عزم رجیب طیب ایردوان ہوٹل سے ملحقہ ولا میں اپنے گھرانے کے ساتھ چھٹیوں کی ایک اور رات گزار رہا تھا۔ اس بات سے بالکل بے خبر کہ اگلے کچھ گھنٹے اس کی زندگی کے اہم اور دشوار ترین لمحات ثابت ہونے والے ہیں۔ اور موت اس سے محض چند منٹ کے فاصلے پر گزرنے آرہی ہے۔

ترک صدر اپنے دوست ابراہیم کے بیٹے ''سرکان یازیجی'' (yazici Serkan) کی دعوت پر اس کے پرآسائش ولا میں اپنے گھرانے کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ سرکان یازیجی کار ریلی میں حصہ لینے والا سابق ڈرائیور تھا، سرکان کا والد ابراہیم سیاست دان اور طیب ایردوان کا دوست تھا۔ ترک پارلیمان کا دو بار رکن رہا تھا، اور ۲۰۱۲ء میں دل کے دورے میں انتقال کر چکا تھا۔ یازیجی فیملی مارمریز شہر میں یازیجی ماریس ہوٹل، ملحقہ گرانڈ یازیجی کلب، ٹربن ہوٹل اور ملحقہ ولا کی مالک تھی۔ مارمریز کے خاموش نیلے پانیوں، تیراکی کے لیے حسین ساحلوں، سرسبز پہاڑوں اور پرلطف موسموں نے ایک زمانے سے سیاحوں کو اپنا اسیر کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچ کر اور کچھ وقت گزار کر زندگی نہایت خوب صورت اور پرسکون ہونے پر یقین آجاتا تھا۔ لیکن ہے یوں کہ زندگی کے ہزار رنگ ہیں۔ اس وقت بھی سب کچھ خوب صورت اور پرسکون ہرگز نہیں تھا۔

رات اتر رہی تھی کہ ایردوان کو ٹرکش فرسٹ آرمی کمانڈر امت دندار (Dundar Umit) کی کال موصول ہوئی۔ ''ایک بڑی بغاوت رونما ہو رہی ہے سر! اور انقرہ میں حالات کنٹرول میں نہیں ہیں۔ آپ کو جان سے مارنے یا گرفتار کرنے کی کوششیں شروع ہو چکی ہیں۔ سر! آپ قانونی صدر ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں''۔

اس رات کی کچھ رپورٹس ایسی ہیں جن کے مطابق بغاوت سے چند گھنٹوں پہلے اس سازش کی بو سونگھ لی گئی تھی۔ اعلیٰ افسران کی طرف سے ٹینکوں اور فوجی گاڑیوں کی ہر طرح کی نقل وحرکت پر فوری پابندی لگا دی گئی تھی۔ اور فوجی طیاروں کی پروازیں بند کر دی گئی تھیں۔ باغی ٹولے کو جب ان احکامات کا علم ہوا تو اس میں بے چینی شروع ہو گئی اور اسی گھبراہٹ میں بغاوت کا اصل طے شدہ وقت جو ہفتے کی صبح تین بجے تھا تبدیل کر کے فوری عملدرآمد کا فیصلہ کیا گیا اور جمعہ کی رات سات بجے ہی منصوبے پر عمل کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ اس کارروائی کے ساتھ انقرہ اور استنبول کی سڑکوں پر ٹینک اور فوجی دستوں کی نقل وحمل شروع ہو چکی تھی۔ استنبول میں باسفورس کے پلوں پر آمد ورفت بند کرنے اور علامتی قبضے کے لیے ٹینک اور مسلح فوجی کھڑے کر دیے گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں انقرہ کی فضاؤں میں بارہ ایف سولہ جنگی طیارے پرواز کرنے لگے، منتخب افراد کی گرفتاری یا قتل کے لیے مختلف دستے چل پڑے تھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس پر چڑھائی شروع کر دی گئی۔ مسلح افواج کے سربراہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ تین بلیک ہاک ہیلی کاپٹر جو رات کی تاریکی میں نظر نہ آسکیں، ایردوان کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کر دیے گئے جن میں چالیس کمانڈوز موجود تھے۔

ایردوان کو بہت جلد اہم فیصلے کرنے تھے۔ وقت بہت نازک بھی تھا اور بہت کم بھی۔ جس ولا میں ایردوان موجود تھے، اس سے ۹۵ کلومیٹر دور ایک گھنٹے سے زائد کی ڈرائیو پر ڈالمان (Dalaman) ائیرپورٹ تھا جہاں ایردوان کا صدارتی جہاز بلوایا جا سکتا تھا۔ اگرچہ یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ ائیرپورٹ باغیوں کے قبضے میں جا چکا ہو۔ یا ایردوان کے پہنچنے تک دشمن بھی پہنچ جائیں۔ دارالحکومت انقرہ، استنبول، ازمیر سے مسلسل تشویشناک خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ ایسے میں کچھ موجود ساتھیوں نے ایردوان کو قریبی یونانی ائیرپورٹ پر پناہ لینے کا مشورہ دیا جو ایردوان نے سخت الفاظ میں مسترد کر دیا۔ دوسرا مشورہ روپوش ہو جانے کا تھا، یہ بھی رد کر دیا گیا۔ ایردوان نے تیسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے حالات اور بغاوت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جنرل ڈائریکٹوریٹ آف سیکورٹی کے 92-S Sikorsky ہیلی کاپٹر میں سوار ہوا اور ڈالمان (Dalaman) ائیرپورٹ کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کا صدارتی جہاز آنا تھا۔

لیکن رکیے۔ ذرا واقعات کو یہیں چھوڑ کر میری دو باتیں سن لیجیے جو یہ کہانی سناتے وقت مسلسل میرے ذہن میں چکرا رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترکی زبان میں ایردوان کا مطلب ہے پیدائشی دلیر، فطری جنگجو اور سپاہی۔ دوسری بات یہ کہ ۲۷ مئی ۲۰۱۶ء کو میرے محبوب چچا جان اور رہنما مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی استنبول میں تھے اور میں ان کے ساتھ تھا۔ عم مکرم کے عزیز ترک شاگرد جناب خیری دمرجی نے رات کے کھانے کی دعوت کی۔ یہ خوبصورت مطعم ''شاخِ زرّیں'' (Golden horn) کے کنارے ''قاسم پاشا'' کے علاقے میں تھا۔ قاسم پاشا کی ایک خاص بات چچا جان نے اور ایک جناب خیری دمرجی نے بتائی۔ عمِ مکرم نے کہا کہ سلطان محمد فاتح نے فتح قسطنطنیہ کے موقع پر جب جہاز خشکی پر چلائے تھے تو تقسیم (Teksim) کی طرف سے یہ جہاز چڑھائے گئے تھے اور قاسم پاشا وہ جگہ تھی جہاں یہ جہاز شاخ زرّیں میں اتارے گئے۔ خیری دمرجی نے کہا۔ قاسم پاشا جنگجو اور لڑاکوں کے لیے مشہور ہے۔ مخالف کو ڈرانے کے لیے کہا جاتا ہے، ''میں قاسم پاشا کا ہوں''۔ اور طیب ایردوان قاسم پاشا کا ہے۔

کہانی پھر شروع کرتے ہیں۔ ایردوان کی روانگی کے چند منٹ بعد وہ تینوں بلیک ہاک ہیلی کاپٹر مارمریز آپہنچے جو ایردوان کے لیے آئے تھے۔ گرانڈ یازیجی ہوٹل کے قریب اتر کر باغی کمانڈوز کو صدر کی تلاش تھی، لیکن انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ایردوان گرانڈ یازیجی ہوٹل میں نہیں ملحقہ ولا میں مقیم تھے۔ کمانڈوز نے ہوٹل کا محاصرہ کر لیا۔ ہوائی فائر کیے اور درّانہ اندر گھستے چلے گئے۔ ہوٹل میں بڑی تعداد میں سیاح خاص طور

پر برطانوی باشندے مقیم تھے۔ انہی سیاحوں میں ہالینڈ کا ایک جوڑا گرٹ جان ڈی گراف (Graafde Gert jan) اور ان کی بیوی تھریسیا بھی تھے۔ رات کو فائرنگ کی آواز سن کر وہ بیدار ہوئے اور ابتدا میں اسے آتش بازی سمجھے۔ تھریسیا نے صورتحال جاننے کے لیے دروازہ کھولا تو اس کا سامنا مسلح فوجیوں سے ہوا جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مسلسل چلاّ رہے تھے۔ ”ایردوان کہاں ہے؟ ایردوان کہاں ہے؟“

یہ اندازہ ہونے کے بعد کہ ایردوان ہوٹل میں نہیں ہے، کمانڈوز نے وِلا کا رخ کیا جہاں ایردوان کے تین صدارتی محافظ اور ایک سرکاری عہدے دار موجود تھا۔ فائرنگ کے تبادلے میں دونوں طرف جانی نقصان ہوا۔ ایردوان کے دو محافظ بھی مارے گئے اور باقی کو کمانڈوز نے گرفتار کرلیا۔ ایردوان کی گرفتاری میں ناکامی کے بعد ان کمانڈوز میں سے اکثر انہی ہیلی کاپٹر میں واپس چلے گئے۔ تیسرا ہیلی کاپٹر خراب ہونے کے باعث باقی فوجی اپنا اسلحہ پھینک کر قریبی پہاڑوں میں روپوش ہوگئے۔ اسی دوران انقرہ میں وزیر اعظم بن علی یلدرم (Binali yildirim) بھی اپنی تلاش میں سرگرم باغیوں سے بہت معمولی فرق سے بچ نکلے، اور یہ بیان جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ فوج کی ایک مختصر سی اقلیت نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی ہے، جسے کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ادھر استنبول اور انقرہ میں فائرنگ، دھماکوں اور فوجیوں کی نقل و حرکت سے عوام کو سنگینی کا اندازہ ہونا شروع ہوگیا تھا اور لوگ سڑکوں پر نکلنے لگے تھے۔ اسی دوران ترکی سرکاری ٹیلی ویژن پر قبضہ کر کے خبریں پڑھنے والی خاتون سے گن پوائنٹ پر ایک تحریر پڑھوائی گئی۔ صورت حال واضح ہوگئی تھی۔ ترکی کے عوام کو ایک اور فوجی بغاوت کا سامنا تھا۔ لیکن باغیوں کو کتنی کامیابی مل چکی ہے؟ وہ کہاں کہاں قابض ہیں اور کون کون سی شخصیات ان کی تحویل میں ہیں؟ ان میں سے کچھ واضح نہیں تھا۔ لیکن جو کچھ واضح تھا، اس سے لوگوں میں خوف و ہراس کم تھا اور اشتعال زیادہ۔ ترکی میں ایک نئی روایت کا آغاز تھا۔ بغاوت کے خلاف بغاوت۔

ایک رپورٹ کے مطابق ازمیر کے عدنان مندریس (Adnan Menderes) ایئرپورٹ سے وی آئی پی جہاز ڈالمان ایئرپورٹ بلوایا گیا۔ یہ جہاز رات بارہ بج کر چالیس منٹ پر ڈالمان اترا۔ فوراً تیل بھرا گیا اور اگلی فلائٹ کی تیاری کی گئی۔ اسی دوران طیب ایردوان اور ساتھی بڑا خطرہ مول لے کر ڈالمان ایئرپورٹ پہنچ چکے تھے۔ یہاں جہاز میں بغاوت کی صحیح ترصورتحال ایردوان کے علم میں آئی اور سرکاری ٹیلی ویژن پر قبضے اور باغیوں کی طرف سے اعلان کی اطلاع بھی دی گئی۔ ضروری تھا کہ طیب ایردوان کا ترک عوام سے براہ راست رابطہ ہو، لیکن رابطے بند تھے اور سرکاری ٹیلی ویژن اپنا ترجمان نہیں رہا تھا۔ ایسے میں سی این این ترک (CNN Turk) کی ایک خاتون میزبان سے فیس ٹائم ایپلی کیشن کے ذریعے رابطہ ہوا۔ اس خوف و ہراس کے عالم میں اس جرات مند عورت نے یہ ویڈیو پیغام پورے ترکی اور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ایردوان کے اس واضح پیغام نے لوگوں میں ایک تازہ روح پھونک دی کہ ”عوام سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئیں، میں محفوظ ہوں اور ہم عوام کے ساتھ مل کر اس ٹولے کو ناکام بنا دیں گے“۔ محض اس پیغام نے تختہ الٹنے والوں کا تختہ الٹ دیا۔ اسی کے ساتھ ایردوان نے پولیس کو حکم دیا کہ وہ باغیوں کا مقابلہ کرے اور ان سے ہتھیار ڈلوا کر گرفتار کرے۔ پولیس کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی لوگ سڑکوں اور گلیوں میں آچکے تھے۔ داد دینی چاہیے کہ ان لوگوں میں ایردوان کے سیاسی مخالف بھی موجود تھے، جو فوجی بغاوت کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ ٹینکوں کے سامنے نہتے لوگوں کا لیٹ جانا یا اس پر چڑھ کر عملے کو گرفتار کرنا غیر معمولی جرأت اور بہادری چاہتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ یہ عمل کارفرما نہ ہوتا تو حکومت تنہا اس طرح، اتنی جلد بغاوت پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔

اسی دوران ایردوان کا گلف اسٹریم جی۔۴۵۰ طیارہ پرواز کے لیے تیار تھا۔ یہ خطرہ بالکل سامنے تھا کہ فضا میں موجود باغی ایف۔۱۶ طیارے جو ایردوان کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں، اسے فوراً مار گرائیں گے۔ اس کے علاوہ بڑا سوال یہ تھا کہ دارالحکومت انقرہ جایا جائے یا استنبول یا کسی اور شہر؟ ایردوان نے استنبول جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بذاتِ خود ایک مشکل فیصلہ تھا، اس لیے کہ استنبول ایئرپورٹ کا کنٹرول ٹاور باغیوں کے قبضے میں جاچکا تھا۔ طیارے کا پائلٹ بارس یورت سیون (Baris Yurtseven) پہلے بھی وی آئی پی فلائٹس کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے ایردوان کے فیصلے کے مطابق رات ایک بج کر ۴۳ منٹ پر ڈالمان سے استنبول کے لیے اڑان بھری۔ اور ترکی کے شمال مغربی حصے پر اپنا راستہ متعین کیا۔

تکنیکی طور پر یہ ATA-TC طیارہ ٹرانس پونڈر (Transponder) طیارہ ہے، جو اپنی شناخت، بلندی، رفتار، پرواز کی سمت وغیرہ کے سگنل ٹریفک کنٹرول مرکز کے لیے نشر کرتا ہے۔ صدارتی پرواز کی صورت میں ٹرانس پونڈر آف کردیا جاتا ہے۔ عام صورت میں صدارتی طیارے کا کوڈ ”ٹرکش ری پبلک ون“ مقرر کیا جاتا ہے۔ بارس اور معاون پائلٹ نے کمال عقل مندی سے ٹرانس پونڈر بند نہیں کیا اور صدارتی طیارے کو چھپانے کے لیے اس کی شناخت ٹی کے۔۸۴۵۶ مقرر کی جو استنبول جانے والی ایک مسافر بردار کمرشل فلائٹ تھی۔ ادھر دشمن ایردوان کی تاک میں تھے۔ انقرہ اکنجی مستقر (Ankara Akinci Base) باغیوں کے قبضے میں تھا۔ وہاں سے اڑ کر آئے ہوئے دو باغی ایف سولہ فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ بعض حوالوں کے مطابق ان طیاروں نے بارس سے شناخت پوچھی اور مسافر بردار طیارہ دیکھ کر تذبذب کا شکار ہوگئے۔ ایک مسافر بردار طیارہ جس میں بین الاقوامی مسافر موجود ہوں مار گرانا بہت بڑا فیصلہ تھا، جس کے سنگین نتائج باغی ٹولے کو بھگتنے پڑ سکتے تھے۔ چنانچہ شبے کا شکار ایف سولہ گلف سٹریم صدارتی کے ساتھ ساتھ رہے لیکن حملہ نہیں کیا۔ آپ ان کٹھن لمحات کا تصور کرسکتے ہیں۔

اگر درج ذیل رپورٹ درست ہے تو اللہ نے ایردوان کی عین اس وقت ایک اور مدد کی جسے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ امکان موجود تھا کہ جُل دینے کے باوجود صدارتی طیارہ پہچان لیا جائے کیونکہ کڑیاں جوڑنے سے نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ یہ صدارتی پرواز ہے۔ لیکن عین اس وقت جب ایک ایف سولہ صدارتی طیارے پر میزائل داغنے کے لیے تیار ہوچکا تھا، ایف سولہ طیاروں کا ایندھن ختم ہوگیا اور انہیں تیل لینے کے لیے علاقے سے ہٹنا پڑا۔

بحر مارمرہ پر پرواز کرتے ہوئے گلف سٹریم طیارہ صدر ایردوان کو لیے ہوئے رات دو بج کر دس منٹ پر بیگا (Biga) پہنچا جو استنبول سے ۱۷۱ کلومیٹر اور اوسطاً انیس منٹ کے فضائی فاصلے پر ہے۔ ادھر استنبول کنٹرول ٹاور میں باغیوں کا فوجی دستہ موجود تھا لیکن اس نے کسی کارروائی کے بجائے اپنے مزید ساتھیوں کا انتظار بہتر سمجھا۔ جلد ہی حکومت کے حامی پولیس کے دستے آپہنچے اور باغیوں کی گرفتاری شروع کردی گئی۔ اُدھر بیگا پر صدارتی طیارہ استنبول کنٹرول ٹاور کی صورتِ حال واضح ہونے تک ایک گھنٹے سے فضا میں چکّر کاٹ رہا تھا۔ جیسے ہی کنٹرول ٹاور حامیوں کے ہاتھ میں آیا، صدارتی جہاز نے استنبول ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت مانگی۔ ٹاور نے زمینی مخدوش اور غیر یقینی صورتِ حال پائلٹس کو بتائی۔ اس کے باوجود پائلٹ نے لینڈنگ کی تیاری شروع کی اور دونوں ایف سولہ کی پوزیشن معلوم کی۔ ٹاور نے اسے بتایا کہ دونوں ایف سولہ واپس آرہے ہیں، اور ان کی نیّت کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا، نیز رن وے کی روشنیاں بجھا دی گئی ہیں، اس

لیےان سے لینڈنگ میں مدد نہیں مل سکتی۔

ہنگامی صورتحال میں دیکھنے کے لیے جی۔۴۵۰ طیارے میں ایک خصوصی انفرا ریڈ نظام موجود ہوتا ہے جسے ای وی ایس (EVS) کہا جاتا ہے۔ اردوان نے بارس کو طیارے کی اپنی روشنیوں میں لینڈنگ کرنے کو کہا جو بہرحال ایک خطرہ تھا۔ رات تین بج کر اٹھارہ منٹ پر صدارتی طیارہ ٹریک نمبر ۱۷/۳۵ پر شمالی جنوبی رخ پر بحفاظت اتر گیا۔ اور وہاں سے اس نے جنرل ایوی ایشن اپیرن کا رخ کیا۔ پولیس کے خصوصی دستوں نے اپیرن کی ذمے داریاں نبھائیں۔ طیارہ جیسے ہی اپیرن پر رکا، اس کا انجن بند کردیا گیا اور بتیاں بجھادی گئیں۔ فوراً بعد ایف سولہ طیارے باسفورس کی طرف سے اتاترک ایئرپورٹ پر آپہنچے۔ لیکن رن وے پر مکمل تاریکی کے باعث طیارے کو تلاش نہ کرسکے۔ نیچی پرواز کرتے اور آواز کی حدود توڑتے ہوئے ایف سولہ کی آواز بم دھماکے جیسی تھی، جس سے کئی ہینگرز کے شیشے ٹوٹ گئے۔ سہمے ہوئے لوگ اور سراسیمہ ہوگئے۔ مشتعل ہجوم اور مشتعل ہوگیا۔

کہانی اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ لیکن مجھے یہیں تک یہ قصہ سنانا تھا کیوں کہ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب کو معلوم ہے، خاص طور پر استنبول ایئرپورٹ پر خطاب کرتے ہوئے اردوان کا یہ جملہ کہ ''یہ خدا کا ایک تحفہ ہے''۔ اور چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ جملہ کہ ''میں چند منٹ کے فرق سے موت یا گرفتاری سے بچا ہوں''۔

۲۰۱۶ء میں ترکی فوج کی اس بغاوت کے بارے میں اب تک بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ اس کے پیچھے فتح اللہ گولن کے لوگ تھے۔ سی آئی اے تھی۔ غیرملکی سازش تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تک کہا گیا کہ یہ ڈرامہ خود اردوان حکومت نے رچایا تھا تاکہ اپنے مقاصد حاصل کرسکے۔ یہ تجزیے میری آج کی تحریر کے دائرے میں نہیں ہیں۔ اردوان کے سیاسی اور قومی نظریات پر اعتراض اٹھائے جاسکتے ہیں۔ اس کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی جاسکتی ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ ناکام بغاوت کے بعد حکومتی ردعمل اور بے شمار لوگوں کی پکڑ دھکڑ سے بہت سے حامی بھی مطمئن نہیں ہیں۔ فتح اللہ گولن سے اس کی مخالفت پر سوال اٹھائے جاسکتے ہیں۔ ہر بات پر اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ایک بات سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔

اور وہ یہ کہ ۱۵/اور ۱۶ جولائی ۲۰۱۶ء کی درمیانی رات اردوان نے للکار کر اپنے مخالفین سے کہا تھا کہ ''میرا نام اردوان ہے اور میں قاسم پاشا کا ہوں۔''

(بحوالہ: ''ڈیلی ڈاٹ پی کے''۔ ۲۳ جولائی ۲۰۱۷ء)

کیا ایک مضبوط شخصیت ملک تبدیل کرسکتی ہے؟

شادی حامد

اصلاً امریکی جریدے ''دی اٹلانٹک'' میں شائع ہونے والے اس مضمون میں شادی حامد نے اس نکتے پر بحث کی ہے کہ تاریخ اور روایات کے اعتبار سے اہم سمجھے جانے والے کسی بھی ملک کی ہیئت تبدیل کرنے میں طاقتور شخصیات کا کیا کردار ہوا کرتا ہے اور کیا ایسا کردار ادا کرنا اب بھی ممکن ہے۔

سیاست دانوں، اور خاص طور پر نظریاتی سیاست دانوں، کو جلد یا بدیر ''اب آگے کیا؟'' کے سوال کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اپریل میں منعقدہ ایک ریفرنڈم میں ترک صدر رجب طیب اردوان کو غیرمعمولی اختیارات حاصل ہوچکے ہیں۔ اپوزیشن نے ان پر دھاندلی کا الزام بھی عائد کیا ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اب صدر اردوان ترک سیاست پر ۲۰۲۹ء تک چھائے رہیں گے۔ ترک سیاست، معاشرت اور معیشت کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کے لیے ان کے پاس ایک عشرے سے زیادہ وقت ہے۔

اقتدار کے پہلے عشرے کے دوران رجب طیب اردوان کی جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (اے کے پی) نے قومی معیشت کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں دور کردیں۔ آزاد منڈی کی معیشت سے متعلق تمام اصلاحات نافذ کی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ فوج کو بھی، جو جمہوریت کو پنپنے ہی نہیں دے رہی تھی، سیاسی معاملات میں مداخلت کے حوالے سے غیرموثر کردیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہی وہ کامیابی ہے جس کا خواب اے کے پی نے دیکھا تھا؟ ایسا لگتا ہے کہ اے کے پی اب اپنی ہی کامیابی کے دام میں گرفتار ہوچکی ہے۔ ملک میں جس قدر آزادی عوام کو ملنی چاہیے تھی، وہ اب تک نہیں ملی۔ جمہوریت کے تحت اداروں کو جس قدر آزادی دی جانی چاہیے تھی وہ نہیں دی گئی۔ صدر اردوان چاہتے ہیں کہ انہیں صرف قومی معیشت و سیاست تبدیل کرنے کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ دیگر حوالوں سے بھی یاد رکھا جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان میں اتنی بصیرت ہے کہ ترکی کا فکری و عملی ڈھانچا ہی تبدیل کردیں؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اردوان ٹیکنو کریٹ ہیں اور کسی بھی ملک کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کے لیے اتنا کافی نہیں ہوا کرتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اردوان کسی اور کو ابھرنے دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنے سامنے کسی اور کا بھرپور وجود برداشت نہیں کرسکتے۔ وزیر اعظم احمد داؤد اوغلو کا جانا اس نکتے کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔ احمد داؤد اوغلو نے اے کے پی کی پالیسیاں تیار کرنے اور انہیں عمل کی دنیا میں رکھنے کے قابل بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

سیاسی تجزیہ کاروں کے لیے یہ سوال ہمیشہ اہم رہا ہے کہ کیا شخصیات معاشروں کو تبدیل کرسکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں کوئی حتمی رائے دینا ہمیشہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ تاریخ، روایات اور اقدار کے اعتبار سے مضبوط معاشرہ کبھی کسی ایک آدھ شخصیت کے ہاتھوں تبدیل نہیں ہوا کرتا۔ ترکی بھی ایک ایسا ہی معاشرہ ہے، جس کا پورا ڈھانچا تبدیل کرنے میں کوئی ایک شخصیت کبھی بھرپور کامیابی حاصل نہیں کرسکتی۔ کوئی بھی شخصیت طاقت کے ذریعے تھوڑی بہت تبدیلیاں ضرور لاسکتی ہے مگر حقیقی معنوں میں دیرپا، مثبت تبدیلیاں یقینی بنانا کسی ایک شخصیت کے بس کی بات نہیں۔ حقیقی اور غیرجانبدار سیاسی تجزیہ کار کبھی اس نکتے کی وکالت نہیں کرتے کہ شخصیات کو رول ماڈل کی حیثیت سے قبول کیا جائے اور ان کی ہر بات پر آمنّا وصدقنا کہا جائے۔

۲۰۰۱ء کے ایک مضمون میں ڈین بائیمین اور کین پولاک نے اس نکتے پر بحث کی تھی کہ اداروں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے شخصیات کو بچایا جائے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ بہت سی انتہائی غیرمعمولی شخصیات بھی اداروں کی طاقت کے سامنے بجھ سی جاتی ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ ایسا بہت کچھ نہیں کر پاتیں جو وہ بخوبی کرسکتی ہیں۔ مگر خیر، یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بہت سی سیاسی اور عسکری شخصیات اپنی طاقت میں اضافے کے لیے اداروں کو جان بوجھ کر کمزور کرتی جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو وہ اداروں کو تحلیل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ڈین بائیمین اور کین پولاک نے لکھا تھا کہ انتہائی غیرمعمولی، طلسماتی شخصیت اداروں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوسکتی ہے اور بہت سی مثبت تبدیلیاں بھی لاسکتی ہے۔ رجب طیب اردوان میں بھی ایسا کرنے کی صلاحیت تھی۔ انہیں ایسی قوتوں کا سامنا تھا جو کھل کر سامنے تھیں بھی اور نہیں بھی تھیں۔ ترکی ایک زمانے تک فوج، عدلیہ اور سیکورٹی کے اداروں کے

چنگل میں پھنسا رہا۔ کئی عشروں تک عوامی اداروں کے پنپنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی۔ فوج نے جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا اور عدلیہ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ عوام کی خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرنے کے لیے اندرونی سلامتی کے نیٹ ورک سے بھرپور مدد لی گئی۔

رجب طیب ایردوان نے متعدد مواقع پر اپنے آپ کو مصطفیٰ کمال اتاترک کے پائے کا رہنما بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مارچ ۲۰۱۴ء میں ایک کلیدی پریس کانفرنس سے قبل اے کے پی نے ایردوان کو ترکی کے نئے معمار کی حیثیت سے پیش کیا اور پھر ایک وڈیو میں ایردوان نے کہا کہ وہ ترکی کی دوسری جنگ آزادی کی قیادت کر رہے ہیں۔

میں نے اپنی ایک کتاب کی تیاری کے سلسلے میں ایردوان اور دیگر شخصیات کی صلاحیت وسکت کے حوالے سے بہت سوچا ہے۔ عبداللہ گل ہی کی مثال لیجیے۔ وہ ایردوان کے لیے ایک بڑے حریف کی شکل میں ابھر سکتے تھے اور ابھر رہے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایردوان کی جگہ عبداللہ گل جیسا نرم خو معاشیات کا پروفیسر اے کے پی کا سربراہ بن جاتا تو کیا ہوتا؟ عبداللہ گل کے سابق مشیر نے مجھے بتایا کہ عبداللہ گل کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ وہ غیر معمولی حد تک حقیقت پسند تھے۔ انہیں یہ پسند نہ تھا کہ عوام کے بپھرے ہوئے جذبات کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ اگر انہیں کسی اقدام کے ممکنہ نتائج کے حوالے سے کچھ زیادہ امید نہ ہوتی تو وہ اس معاملے میں آگے بڑھنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ عبداللہ گل اس بات کے بھی سخت خلاف تھے کہ بڑھک آمیز باتیں کر کے لوگوں کو تقسیم کیا جائے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر وہ ہوتے تو مذہبی اور سماجی رجعت پسندی کو بنیاد بنا کر معاشرے میں کسی حقیقی بنیادی تبدیلی کی راہ ہموار کرنے میں اپنا کردار ضرور ادا کرتے۔

مذہبی رجعت پسندی اجتماعی ہی نہیں انفرادی سطح پر بھی بہت اہم ہے۔ میرے ذہن میں اس حوالے سے کم ہی شک ہے کہ ایردوان بھی عام ترکوں کو مذہبی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ۲۰۱۱ء کے بعد سے ان کی سوچ میں واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ ۲۰۱۱ء میں ایردوان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد سے انہوں نے موت کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ ہر مسلمان کی طرح ان کے ذہن میں بھی یہ نکتہ موجود ہے کہ ایک دن اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اور ایردوان کو صرف اپنا ذاتی حساب نہیں دینا بلکہ قومی لیڈر کی حیثیت سے عام ترکوں کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا حساب بھی دینا ہے۔ اور اس سے ایک قدم آگے جا کر اسلامی دنیا میں ترکی کے بڑھتے ہوئے قائدانہ کردار کے حوالے سے بھی ان پر شدید جوابدہی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک حدیث بھی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ’’ہم میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی حوالے سے ذمہ دار بنایا گیا ہے‘‘ یعنی کچھ لوگوں کی ذمہ داری ہمارے سروں پر ڈالی گئی ہے اور آخرت میں ہم سے اس ذمہ داری کے حوالے سے سوال کیا جائے گا۔

ایردوان نے ریاستی قوت کے ذریعے لوگوں میں تقویٰ کی طرف مائل ہونے کا رجحان پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ عمل بالواسطہ رہا ہے۔ انہوں نے کسی پر اسلامی قوانین مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ عوام کو تحریک دی ہے کہ وہ اپنے معاملات درست کرنے پر توجہ دیں اور اس معاملے میں اللہ سے ڈریں۔ شراب پر پابندی عائد کرنا ایک دشوار فیصلہ ہوتا۔ اور آئین میں بھی مذہبی بنیاد پر شراب کی فروخت پر پابندی عائد کرنے کی گنجائش نہیں۔ ایردوان انتظامیہ نے شراب پر ٹیکس بڑھا دیے اور رات دس بجے کے بعد شراب کی فروخت پر پابندی عائد کر دی۔ ترک معاشرے میں جلد شادی کرنے کا رجحان نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ ایردوان نے جلد شادی کرنے والے جوڑوں کے لیے مالی اعانت کا اعلان کیا۔ آبادی میں اضافے کے لیے بھی فیصلہ کیا گیا کہ تین بچے پیدا کرنے والے جوڑوں کی مالی اعانت کی جائے۔

اسقاطِ حمل کے حوالے سے بھی ایردوان کے ہاں کم ہی لچک ہے۔ ان کی پارٹی کے ایک رہنما نے بتایا کہ بعض اوقات ایردوان کا رویہ باپ کا سا ہوتا ہے۔ ان کا کہا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ تو نہیں رکھتا مگر وہ معاشرے کی حقیقی اصلاح چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل بری عادتیں ترک کر دے۔ کئی مواقع پر ایردوان بالکل واضح الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ کسی انسان کو ختم کرنا اور رحمِ مادر میں پلنے والے بچے کو ختم کرنا دونوں ہی قتل ہیں۔

ایردوان اسلام سے متعلق اپنے نظریات کو باضابطہ شکل میں پیش کر کے نافذ کرنے کے معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی رجعت پسندانہ سوچ تھوپی نہ جائے بلکہ مرحلہ وار متعارف کرائی جائے۔ اگر عوام قبول کریں تو ٹھیک، ورنہ معاملات کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور موزوں وقت کا انتظار کیا جائے۔ ترکی میں ایک ایسی جماعت کی حکومت ہے جو اسلامی بنیادیں رکھتی ہے۔ ایسی جماعت اگر ترک آئین کے خلاف جائے تو حیرت کی بات کیا ہے۔ ترک آئین میں سیکولرازم کو باضابطہ نام کے ساتھ احترام بخشا گیا ہے اور مذہبی نظریات کا سرعام اظہار کرنے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ ۲۰۱۶ء میں پارلیمنٹ کے اسپیکر اور اے کے پی کی کلیدی شخصیت اسماعیل کہرمان نے تجویز پیش کی تھی کہ ترک آئین سے سیکولرازم کے احترام کا اہتمام ختم کر دیا جائے مگر ایردوان نے ان کی رائے سے خود کو فوراً الگ کر لیا۔ ان کا کہنا ہے کہ آئین کے حوالے سے فی الحال کوئی مہم جوئی نہیں کی جا سکتی۔

ایردوان کے پاس معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے ایک وژن ہے مگر یہ وژن ہر اعتبار سے درست اور بہترین نہیں۔ اے کے پی کے پاس حقیقی علماء شاذ و نادر ہی رہے ہیں۔ اسلامی علوم پر گہری نظر اور دسترس رکھنے والے علماء کی اس پارٹی میں کمی رہی ہے۔ ابراہیم کلین اس حوالے سے استثناء کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ ایردوان کے مشیر اور دستِ راست رہے ہیں۔ انہوں نے واشنگٹن کی جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں پڑھایا ہے۔ تمام اسلامی علوم پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔ انہوں نے معاملات کو درست انداز سے چلانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ انہوں نے معروف شیعہ عالم ملا صدر کی سوانح بھی لکھی۔ میں نے ایک بار ابراہیم کلین سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ اسلامی علوم پر غیر معمولی نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایردوان کے لیے غیر معمولی احترام کا اظہار کیا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ اندازہ بھی ہوا کہ ایردوان کو وہ ایک خاص حد تک ہی قائل کر پائے ہیں۔ یعنی اس حد سے آگے جانا ان کے لیے ممکن نہیں۔ گفتگو کے دوران وہ کہیں کہیں جذبات میں اس قدر بہہ گئے کہ مجھ سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ سے بھی باتیں کرنے لگے۔ ابراہم کلین سے گفتگو کے دوران میں نے کئی بار یہ اندازہ لگایا کہ اگر وہ سیاست میں نہ آتے تو پروفیسر کی حیثیت سے زیادہ پرسکون اور بارآور زندگی بسر کرتے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایردوان کے ذہن میں بہت کچھ رہا ہے۔ وہ معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں اور اسلامی اقدار کا فروغ بھی ان کی ترجیحات میں شامل ہے مگر یہ سب کچھ جبلّی یا فطری سطح پر ہے، علمی اور عقلی سطح پر نہیں۔ ایردوان کے ذہن میں جو کچھ ہے وہ ان کے اپنے تجربات کی روشنی میں پروان چڑھا ہے۔ وہ ایک خاص حد سے آگے جا کر نہیں سوچ سکتے۔ اگر وہ معاشرے کی اصلاح اور اسلامی اقدار کے فروغ کے حوالے سے واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ مستند علماء کے ساتھ بیٹھیں، انہیں اپنی رائے اور ارادوں

سے آگاہ کریں اور پھر ان سے رائے طلب کریں۔ اسی صورت کسی مستند نظام کے حوالے سے کچھ کیا جاسکتا ہے۔

ایردوان نے مذہبی امور سے متعلق وزارت دیانت کو عمدگی سے بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ اس وزارت کے تحت مساجد کا نظم و نسق بھی ہے اور ائمہ کی تربیت بھی۔ مذہبی اسکول یا مدارس بھی اسی وزارت کے ماتحت ہیں۔ ایردوان کی واضح ہدایات کی روشنی میں اب اسکولوں میں مذہبی تعلیمات کی کلاسیں لازم کردی گئی ہیں۔ ۲۰۱۵ء کی ایک تقریر میں ایردوان نے اس بات کو بہت فخریہ انداز سے بیان کیا کہ ہائی اسکول کی سطح کے سرکاری مدارس میں انرولمنٹ ۶۵ ہزار سے بڑھ کر ۱۰ لاکھ سے زائد ہوچکی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب ترکی کی نئی نسل اپنی روایت اور ثقافتی ورثے کو زیادہ عمدگی سے سمجھنے کے قابل ہوسکے گی۔

ایردوان نے ''نیا ترکی'' کا نعرہ بھی دیا ہے۔ یہ نعرہ اب محض نعرہ نہیں رہا، منصوبہ بن چکا ہے۔ ترکی میں بہت سوں کی نظر میں ایردوان ایک روحانی لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بات کچھ غلط بھی نہیں۔ انہوں نے اب تک متعدد مواقع پر یہ جتایا ہے کہ وہ ترکی کے لیے محض مادّی نہیں، روحانی اور معاشرتی ترقی بھی چاہتے ہیں یعنی معاشرے میں صرف دولت کی ریل پیل نہ ہو بلکہ اخلاقی اقدار بھی تیزی سے پروان چڑھیں، لوگ پوری دیانت کے ساتھ جئیں، ان کے ضمیر پر کوئی غیر ضروری بوجھ نہ ہو، وہ گناہوں سے آلودہ ہوئے بغیر پرسکون زندگی بسر کریں۔ ایردوان کے طریقوں سے، سوچ سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ وہ پورے معاشرے کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے غیر اسلامی نظریات اور تصورات کو ختم کرنے کے حوالے سے اچھی تیاری کی ہے مگر اس حوالے سے عوام پر زیادہ دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ عوام پر کوئی بھی رائے تھوپی نہ جائے بلکہ وہ اپنے طور پر آگے بڑھیں اور وہ کرگزریں جو ان کے لیے بہتر اور ضروری ہو۔ ترکی میں اسلام پسند عناصر کسی بھی معاملے میں مرحلہ وار تبدیلی یقینی بنانے کے عمل کے لیے لفظ project استعمال کرتے ہیں۔ ایردوان بھی چاہتے ہیں کہ معاشرہ مرحلہ وار تبدیل ہو۔ کوئی بھی تبدیلی اگر راتوں رات رونما ہو تو صرف خرابیاں پیدا کرتی ہے۔

اے کے پی اگر طویل مدت تک حکومت کرنے کی تیاری کر رہی ہے تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کیونکہ جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس کے لیے طویل مدت درکار ہے۔ معاشرے کو مکمل طور پر اور کسی واضح خرابی کے بغیر تبدیل کرنے کے لیے طویل مدت درکار ہوا کرتی ہے۔ ایردوان اپنی تقاریر میں کہہ چکے ہیں کہ ''اے کے پی ایک نسل کی تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی مگر یہ کسی ایک نسل تک محدود نہیں''۔ یعنی جو کچھ اے کے پی کرنا چاہتی ہے وہ کئی نسلوں کا کام ہے اور یہ کام کئی نسلیں مل کر ہی کرسکتی ہیں۔

سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنی معرکہ آراء کتاب ''دی کلیش آف سویلائزیشنز'' میں ترکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اگرچہ نظریاتی اعتبار سے ایک منتشر ملک ہے لیکن اگر اتاترک کی وراثت کو نظر انداز کرے تو متحد ہو کر اسلامی دنیا کا رہبر بن سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اتاترک کی وراثت کو اس جذبے سے بڑھ کر نظر انداز کرے جس جذبے سے روس نے لینن ازم کو نظر انداز کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ترکی کے لیے ایک نئے انداز سے ابھرنا اور ایک نئی شناخت کے تحت عالمی سطح پر کام کرنا انتہائی ممکن ہے۔ اور شاید اب یہ عمل شروع بھی ہوچکا ہے۔ ایردوان اور ان کی پارٹی نے ترکی کو ایک نئی شکل میں دنیا کے سامنے لانا شروع کردیا ہے۔

یورپی یونین نے ترکی کو رکنیت دینے سے اب تک گریز کر کے یہ پیغام دیا ہے کہ اُسے ایسا ترکی کسی حال میں قبول نہیں جو اسلامی روایت اور شناخت کا حامل ہو۔ ایسے میں ایردوان اور ان کے رفقاء کے پاس صرف یہی آپشن رہ جاتا ہے کہ وہ مل کر ترکی کو ایک نئی شناخت دیں، اسلامی دنیا میں نمایاں مقام دلائیں اور یورپی یونین کی رکنیت سے متعلق اپنی تمام امیدوں کا گلا گھونٹ کر خود کو اسلامی دنیا کے لیڈر کے طور پر آگے لائیں۔

ایردوان سے اختلاف کرنے والوں کی اب بھی کمی نہیں۔ پانچ سال پہلے تک ترک ماڈل کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اب بہت سے لوگ ترک ماڈل کے ذکر کو زیادہ فخر سے برداشت نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ ایردوان حکومت نے صحافت کے ہاتھ پیر باندھنے کی کوشش بھی کی ہے اور چند ایک معاملات میں شہری آزادیوں کو بھی حدود میں رکھنے پر بضد رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں اختلاف کرنے والے بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ایک خطرناک رجحان یہ ہے کہ اسلام پسند عناصر مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق چلتا رہے۔ یہ خطرناک ہے۔ جو لوگ کسی بھی حوالے سے تحفظات رکھتے ہیں ان کے اطمینان کے لیے ان کی بات سننا لازم ہے۔ ایسا کرنے ہی سے معاملات کو درست رکھنے میں خاطر خواہ حد تک مدد مل سکتی ہے۔ احمد داؤد اوغلو کے ایک مشیر نے ایک بار مجھ سے کہا کہ ''کچھ لوگ اب تک اتاترک کی لاش کے ساتھ جی رہے ہیں۔ ہمیں اتاترک کی لاش کو قبر میں واپس ڈالنا ہی پڑے گا''۔

اتاترک نے ترکی کو تبدیل کردیا تھا مگر یہ سب کچھ طاقت کے ذریعے تھا۔ اس نے ساری طاقت اپنی ذات میں مرتکز کر کے ترک معاشرے کی بنیاد ہی بدل ڈالی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پسندوں کے لیے ذرا بھی گنجائش نہ رہی کہ اپنی بات پیش کرسکیں، منواسکیں۔ اتاترک نے جو کچھ کیا تھا وہ طاقت کے ذریعے تھا اس لیے سات عشروں کے بعد سب کچھ بدل گیا اور جیسے ہی گنجائش پیدا ہوئی، اسلام پسندوں نے اپنی بات منوائی اور خوب منوائی۔ اب اسلام پسند بھی چاہتے ہیں کہ اپنی حیثیت کا بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ سیکولرازم کی بات کرنے والوں کو ہر محاذ پر مشکلات کا سامنا ہے۔ یہ فطری سا معاملہ ہے۔ ترکی معاشرے کا ڈھانچا ایک بار پھر تبدیل ہو رہا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایک ڈیڑھ عشرے میں سیکولرازم کی بات کرنے والوں کے لیے مشکلات اتنی بڑھ جائیں گی کہ وہ کسی بھی معاملے میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار بھی نہیں کرسکیں گے۔

اتاترک نے جو کچھ کیا تھا اس کے اثرات زائل کرنے کے لیے اب ایردوان اور ان کے رفقاء غیر محسوس انداز سے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ ترک عوام کے لیے ایک نئی زندگی بسر کرنے کا ماحول پیدا کیا جارہا ہے۔ سیکولرازم کو دیس نکالا دینے کی تیاری کی جارہی ہے مگر یہ سب کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ ایردوان اور ان کے رفقاء چاہتے ہیں کہ کسی بھی معاملے میں طاقت غیر ضروری طور پر بروئے کار نہ لائی جائے۔ سوشل انجینئرنگ غیر محسوس طریقے سے کی جارہی ہے۔ سب کچھ مرحلہ وار ہو رہا ہے۔ کسی بھی معاملے میں پورے معاشرے سے ٹکرانے کی تیاری نہیں کی گئی اور نہ ہی اب بھی ایسا کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ ہیڈ اسکارف کے معاملے میں بھی اے کے پی نے غیر لچک دار رویہ نہیں دکھایا۔ سب کچھ عوام کی مرضی سے ہوا ہے۔ اے کے پی کے رجعت پسند رہنماؤں کو رام کرنے پر توجہ دی گئی ہے تاکہ وہ بھڑک کر کچھ ایسا نہ کر بیٹھیں کہ کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"How much can one strongman change a country?". ("brookings.edu". June 27, 2017)

پاکستان: ٹرمپ کی ممکنہ پالیسی

Whitney Kassel / Philip Reiner

جیسا کہ ٹرمپ انتظامیہ نے افغان جنگ کے حوالے سے اپنی پالیسی از سرِ نو مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اور امریکی حکمت عملی میں یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ افغانستان میں کتنی فوج رکھی جانی چاہیے۔ واشنگٹن اپنی حکمت عملی کے تحت آہستہ آہستہ افغانستان میں اپنی فوج میں اضافہ کر رہا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان میں امریکا اپنی موجودگی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ دفاعی سیکرٹری Jim Mattis، جنھیں صدر ٹرمپ نے افغانستان کے حوالے سے فیصلے کرنے کی اجازت دی ہے، ان کا کہنا ہے کہ جولائی کے اختتام تک نئی حکمت عملی سامنے آجائے گی۔

اگر افغانستان میں کسی حکمت عملی کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو امریکا کو افغانستان کے پڑوسی ملک پاکستان، جو کہ افغان طالبان اور حقانی نیٹ ورک جیسے دہشت گرد گروہوں کی مختلف طریقوں سے مدد جاری رکھے ہوئے ہے، کے حوالے سے اپنی پالیسی پر از سرِ نو غور کرنا ہوگا۔ چاہے کوئی یقین کرے یا نہ کرے، لیکن یہ بات بالکل عیاں ہے کہ پاکستان کی آئی ایس آئی براہ راست ان گروہوں کو اسلحہ اور مالی تعاون فراہم کر رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج طالبان پہلے سے بہتر حالت میں ہیں، جدید ہتھیاروں سے لیس ہیں، اور مؤثر کارروائیاں کرتے ہیں، اور پاکستانی فوج کے افسران ان گروہوں کی خفیہ مدد کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ آئی ایس آئی کے ان عسکریت پسندوں کو براہ راست مدد کے ثبوت تو نہ ہونے کے برابر ہیں، لیکن یہ اس ہی کی مدد ہے جس کی وجہ سے یہ گروہ نہ صرف فعال ہیں، بلکہ امریکی، افغان اور نیٹو افواج کو نشانہ بھی بناتے ہیں۔

امریکا نے پاکستان کو افغانستان میں جاری انسدادِ دہشت گردی کے آپریشن میں تعاون کے بدلے میں اربوں ڈالر کی سول اور فوجی امداد دی، باجود اس کے کہ پاکستان امریکا کے ساتھ ''ڈبل گیم'' کھیل رہا تھا۔ امریکا نے اس تعاون کے خاتمے اور زمینی راستے کی بندش کے ڈر سے پاکستان کی جو امداد جاری رکھی، اس نے پاکستانی حکام کو اس قابل بنایا کہ وہ عسکریت پسندوں کی مالی مدد کرتے رہیں اور اپنے ''ڈبل گیم'' کو بھی جاری رکھیں۔

امریکا کو اس مسئلے کے ساتھ کس طرح نمٹنا چاہیے؟

حالانکہ اوباما انتظامیہ نے پاکستان کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن ان کی حکمت عملی پاکستان کی ڈبل گیم کی پالیسی میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کر سکی۔ ٹرمپ انتظامیہ نے ابھی تک اپنی پالیسی واضح نہیں کی، لیکن امکان یہی ہے کہ اوباما سے بھی زیادہ سخت پالیسی اپنائی جائے گی۔ اور یہ حکمت عملی غلط ثابت ہوگی، کیوں کہ افغانستان کے استحکام کے لیے پاکستان کے خدشات کو دور کیے بغیر کوئی بھی حکمت عملی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور ایسی حکمت عملی سے امریکا کو پاکستان کے ساتھ دیگر اہم مسائل پر بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، خصوصاً پاکستان کا بڑھتا ہوا ایٹمی پروگرام۔

کچھ تجزیہ نگار، جیسا کہ امریکی قومی سلامتی کے سابق مشیر اسٹیفن ہیڈلی اور سیاسی امور کے ماہر معید یوسف کا کہنا ہے کہ امریکا کو افغانستان میں پاکستانی تعاون کے لیے اس کے بھارت کے حوالے سے خدشات دور کرنا ہوں گے۔ کچھ تجزیہ نگار سخت موقف اپناتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر پاکستان افغانستان کے باغی گروہوں کی مدد بند نہیں کرتا تو امریکا کو اس سے تعلقات توڑ دینے چاہییں اور اسے اکیلا کر دینا چاہیے۔

یہ تجزیہ نگار صحیح کہتے ہیں کہ افغانستان میں عسکریت پسندوں کو شکست دینے کے لیے پاکستان کے ''ڈبل گیم'' کو ختم کرنا ہوگا اور پاکستان کی بھارت کے حوالے سے غیر منطقی شرط اور امریکا کے ساتھ اس کے تعلقات کو توڑے بنا بھی یہ ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔

امریکا کو پاکستان کے ساتھ تعلقات کے نتائج کی پروا کیے بغیر اور بنا کسی معافی تلافی کے پاکستان میں ان عسکریت پسندوں کو جو امریکی مفادات کو نقصان پہنچاتے ہیں کھلے عام اور خفیہ طور پر نشانہ بنانا چاہیے۔ اس ہی کے ساتھ پاکستان کی فوجی امداد کو ان دہشت گردوں کے خلاف کارروائی سے مشروط کر دینا چاہیے، جن کی وہ عرصے سے مدد کر رہا ہے اور ان میں وہ دہشت گرد بھی شامل ہیں جو بھارت کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس سے پاکستانی فوج کا جو شخص خراب ہوگا اس کے بدلے میں امریکا کو اسے کچھ انعام دینا چاہیے۔ واشنگٹن کو انسدادِ دہشت گردی میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کے علاوہ روایتی ہتھیار بھی پاکستانی فوج کو فراہم کرنے چاہییں، جن میں حملے کی صلاحیت والے ہیلی کاپٹر، فوجی گاڑیاں اور اسی طرح کے دوسرے ہتھیار جن کا وہ بہت عرصے سے مطالبہ کر رہا ہے۔ اس طرح کے آپشنز پر پہلے بھی غور کیا جاتا رہا ہے لیکن کسی سابقہ انتظامیہ نے اس حکمت عملی کو اپنایا نہیں۔ یہ حکمتِ عملی نہ صرف دہشت گردوں کو ختم کرنے میں مدد دے گی، بلکہ پاکستان کے اس خوف کو بھی ختم کرے گی جو وہ بھارت کے حوالے سے رکھتا ہے۔ اور جس خوف کی وجہ سے وہ دہشت گردوں کی مدد کرتا ہے۔

دہشت گردوں کے ٹھکانوں کا صفایا

پاکستان کے حمایت یافتہ مزاحمت کار گروہوں کو زیادہ جارحانہ طریقے سے نشانہ بنانا ہوگا، جس کے بہت سے فوائد ہوں گے۔ اس سے پاکستان کو یہ تاثر جائے گا کہ امریکا اب اس کا ''ڈبل گیم'' مزید برداشت نہیں کرے گا، اس لیے وہ دہشت گردوں کے خلاف کارروائیاں تیز کر دے گا۔ اس عمل سے وہ گروہ بھی کمزور ہو جائیں گے جو امریکی، افغان، نیٹو فوج اور عام عوام کو نشانہ بناتے ہیں۔ ماضی میں پاکستان نے فاٹا میں امریکی حملوں کو تحمل سے برداشت کیا ہے۔ واشنگٹن کو چاہیے کہ وہ نہ صرف اس علاقے میں اپنے آپریشن کو تیز کرے بلکہ ان علاقوں میں بھی دہشت گردوں کا پیچھا کرے جہاں وہ آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں، جیسا کہ کراچی، بلوچستان اور جنوبی پنجاب۔ پاکستان کے ان علاقوں میں دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہیں انھیں افغانستان میں بغیر کسی جوابی کارروائی کے ڈر سے ڈرامائی انداز میں مزاحمت کا عمل تیز کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ افغانستان کے استحکام اور دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہوں کے خاتمے کے لیے جارحانہ کارروائی اور سفارت کاری کی ضرورت ہے۔

اگلے مرحلے میں امریکا کو پاکستان کی فوجی امداد اس وقت تک کے لیے معطل کر دینی چاہیے جب تک وہ ٹی ٹی پی کے ساتھ ساتھ باقی عسکری گروہوں کے خلاف بھی کارروائی کے لیے رضامندی ظاہر نہ کرے۔ اس سے پاکستانی فوج پر اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے کے لیے دباؤ بڑھے گا۔ پاکستان کی بری اور فضائی فوج انسدادِ دہشت گردی کے آپریشن کے لیے امریکی آلات پر انحصار کرتی ہے۔ امداد کی معطلی کے فوری نتائج برآمد ہوں گے۔ (امریکا کو پاکستانی عوام کی مدد غیر مشروط طور پر جاری رکھنی چاہیے، انھیں اپنے راہنماؤں کے اعمال کی سزا نہیں ملنی چاہیے)۔

لیکن امریکی امداد کی بندش، اس کی مخالفت اور جارحانہ کارروائیاں بھی پاکستان کو مزاحمت کاروں کی مدد کی روش

سے پیچھے نہیں ہٹا سکیں گی، کیوں کہ پاکستان ان کو اپنی قومی سلامتی کی اہم ضرورت سمجھتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کسی بھی امریکی آپریشن کی بھرپور مخالفت کرے گا، جیسا کہ اس نے ۲۰۱۱ء میں اسامہ بن لادن کے خلاف کیے جانے والے آپریشن کی کی تھی اور موقف اپنائے گا کہ امریکا اس کی خودمختاری کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ خاص طور پر پاکستانی فوج سخت برہمی کا اظہار کرے گی۔اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ امریکی فوج پر جوابی حملوں کی دھمکی بھی دے اور اپنے سیاستدانوں پر امریکا سے تعلقات توڑنے کے لیے دباؤ بڑھائے۔ امداد کی معطّلی، انسداد دہشت گردی مہم میں پاک امریکا تعاون کو نقصان پہنچائے گی۔اور پاکستان کو اس بات پر مجبور کرے گی کہ وہ امریکا مخالف طاقتوں (ایران، چین اور روس) سے تعلقات بڑھائے۔اور امداد کی معطّلی کا عمل پاکستان کو اس بات پر بھی مجبور کرسکتا ہے کہ وہ افغانستان اور بھارت میں اپنی پراکسی جنگ لڑے۔

ان نتائج سے بچنے کے لیے امریکا کو پاکستان کو یقین دلانا ہوگا کہ اگر وہ دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کرے گا تو نہ صرف اس کی امداد بحال کر دی جائے گی بلکہ اس کی فوجی امداد میں اضافہ بھی کیا جائے گا۔پاکستانی تعاون کے بدلے میں روایتی فوجی امداد کی اس پیشکش سے امریکی حکام پاکستانی راہنماؤں کا اس بات پر اعتماد بھی بحال کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے روایتی دشمن بھارت کے خلاف اپنا دفاع ان دہشت گرد گروہوں کی مدد کے بغیر بھی کرسکتا ہے۔

ضروری توازن

اس نقطہ نظر کی مخالفت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف پاکستانی کارروائی پر انحصار کرنا ایک حماقت ہوگی،اس کے علاوہ پاکستان کی روایتی فوجی امداد نہ صرف خطے میں عدم توازن پیدا کرے گی بلکہ بھارت کو بھی تنہا کرنے کا باعث بنے گی۔لیکن درحقیقت امداد کا یہ تبادلہ ہی پاکستان کو امریکا کی جارحانہ کارروائیوں کے جواب میں تعلقات توڑنے سے روکے گا۔اور یہ حکمت عملی افغان جنگ کے آغاز سے اب تک نہیں اپنائی گئی۔پاکستان کے خدشات کو دور کرنے کا وعدہ کیے بغیر اس پر دباؤ بڑھانا ایک تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔یہ عمل نہ صرف پاکستان کے امریکا سے تعلقات کو مستقل طور پر منقطع کردے گا، بلکہ امریکا ایک ایسے اتحادی کو بھی کھو بیٹھے گا، جو عالمی دہشت گردی کے حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔مزید یہ کہ امریکا کو پاکستان کے دوہرے معیار سے تو بھرپور طریقے سے نمٹنا ہوگا لیکن نہ ہی امریکا اور نہ دنیا اس بات کی متحمل ہوسکتی ہے کہ ایک ایسی ریاست کو جو تیزی سے ایٹمی ہتھیار بنا رہی ہے اور جوہری پھیلاؤ اور دہشت گردوں کی معاونت کی ایک تاریخ رکھتی ہو، اسے عالمی قوانین سے آزاد کر کے ایک خودسر ریاست بنا دیا جائے۔

بھارت پاکستان کی اس فوجی امداد پر شدید اعتراض کرے گا، لیکن امریکی حکام کو سفارت کاری کے ذریعے بھارت کو اس بات کا یقین دلانا ہوگا کہ پاکستان کے حمایت یافتہ مزاحمت کار بھارت کی سلامتی کے لیے پاکستان کے روایتی ہتھیاروں سے زیادہ بڑا خطرہ ہیں۔اور ان کے خاتمے سے بھارت زیادہ محفوظ ہو جائے گا۔

اوباما کے امریکی فوج کے انخلا کے اعلان سے پاکستان کو محسوس ہوا کہ امریکا کے نکل جانے کے بعد کے مشکل حالات اور افغانستان میں بڑھتے ہوئے بھارتی اثرورسوخ سے اسے اکیلے ہی نمٹنا ہوگا اور امریکا کی جانب سے بھارت کے لیے بڑھتی ہوئی فوجی امداد نے پاکستان کو پراکسی مزاحمت کاروں کی مدد کرنے کی ضرورت پر مجبور کر دیا۔اس طرح امریکا جو چاہتا تھا اس کے بالکل الٹ نتائج برآمد ہوئے۔ان سب حالات کے باوجود پاکستان کی اس پالیسی کی حمایت نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجے میں ہزاروں سویلین لوگوں کی جانیں چلی جائیں۔لیکن اگر پیش کردہ حکمت عملی پر عمل کیا جائے تو بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں، ایک تو پاکستان کے ساتھ تعلقات میں توازن قائم ہوگا اور دوسرا پاکستان کے ’’ڈبل گیم‘‘ کا ویسا ہی خاتمہ ہوگا جس کا وہ مستحق ہے۔

(ترجمہ حافظ محمد نوید نون)

"Calling Pakistan's Bluff".
("Foreign Affairs". July 14, 2017)

بقیہ: روبوٹس:سہولت یا مسئلہ؟

ٹیکنالوجی کو انسان نے اپنی خدمت کے لیے بے مثال مہارت سے استعمال کیا ہے۔آج کا انسان اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانا چاہتا ہے۔اس کی خواہش اور کوشش ہے کہ اسے قدم قدم پر آسانیاں میسر ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ روبوٹس کی مدد سے زندگی کے ہر معاملے کو نہایت آسان بنالیا جائے۔ایسا کرتے وقت بہت سے نازک معاملات کو نظرانداز بھی کیا جارہا ہے۔کوئی نہیں سوچ رہا کہ جب ہر طرف روبوٹس ہوں گے تو انسانوں کے لیے کرنے کے لیے کیا رہ جائے گا اور تب وہ کس طور اپنی روزی روٹی کا اہتمام کریں گے۔

آج ماہرین روبوٹس کو زیادہ سے زیادہ کارگر بنانے کے لیے دن رات تحقیق میں مصروف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت کے حامل روبوٹس زیادہ سے زیادہ تعداد میں مارکیٹ میں لائے جائیں تاکہ عمومی نوعیت کے کاموں کے علاوہ علمی کام بھی روبوٹس انجام دیں۔

روبوٹ کا سب سے پہلا تجربہ تحلیل شدہ چیکوسلوواکیا کے سائنس دان کاریل کاپیک نے کیا تھا۔ انہوں نے ایک ڈرامے میں کچھ مشینی انسانوں کا استعمال کر کے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔سائنس دانوں کو کاپیک کے اس تجربے سے ایک نئی روشنی ملی اور ان کے اندر مشینی انسان بنانے کا جو جذبہ موجزن تھا اس کی تعبیر کے لیے انتہائی محنت کر کے روبوٹ کو انسانی شکل دینے میں مصروف رہے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں جارج ڈیوول اور اینجل برجر نے پیشہ ورانہ سطح پر روبوٹ بنانے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔جس طرح کیلکولیٹر ریاضی کے سوال تیزی سے حل کر دیتا ہے بالکل اسی طرح روبوٹ بھی انسانوں سے کئی گنا تیز رفتار کے ساتھ کام کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس کا دماغ انسان کے دماغ سے زیادہ تیز چلتا ہے اور وہ ہر کام کو بغیر کسی غلطی کے مکمل کرتا ہے۔طب کے شعبے میں روبوٹس نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں۔اب تو نئی دہلی میں بھی روبوٹس کی مدد سے دل کے آپریشن کا تجربہ کیا جاچکا ہے جو کامیاب رہا۔ڈاکٹر تریہن نے ایک کمرے میں بیٹھ کر روبوٹس کو کمپیوٹر کی مدد سے ہدایات دیں اور ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے روبوٹ نے دل کا کامیاب آپریشن کیا۔بات یہیں پر نہیں رکی۔آپریشن کے بعد روبوٹ نے ٹانکے بھی اتنی مہارت سے لگائے کہ ماہرین حیران رہ گئے۔امریکا، جاپان، جرمنی، برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک روبوٹس کو زیادہ سے زیادہ کارگر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔مختلف شعبوں میں روبوٹس سے اس قدر خدمات لی جارہی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

روبوٹس کی مدد سے زندگی کو آسان بنایا جاسکتا ہے اور بنایا جارہا ہے مگر سیاسی قائدین کو اس حوالے سے جامع پالیسی ترتیب دینی چاہیے تاکہ سب کچھ لالچ کی نذر نہ ہوجائے۔ روبوٹس کو تجارتی اور صنعتی معاملات میں بہت زیادہ استعمال کرنے کے حوالے سے نئی پالیسی لانا ہوگی۔دنیا بھر کے نمایاں حکمرانوں کو سوچنا ہوگا کہ اگر روبوٹس کو ہر شعبے میں سوچے سمجھے بغیر انٹری دی جاتی رہی تو معاملات سلجھنے کے بجائے الجھتے چلے جائیں گے۔اگر انسان کا مفاد سوچے بغیر محض مشینوں پر انحصار کی پالیسی اپنائی گئی تو معاملات خرابی کی طرف جائیں گے۔

(بشکریہ:’’راشٹریہ سہارا‘‘۔نئی دہلی)

حزب اللہ کی شام میں شاندار کامیابیاں

Sahar Atrache

شام میں چار برس سے جاری بھرپور عسکری مداخلت کے باوجود حزب اللہ ک ہمیشہ کی طرح طاقتور نظر آتی ہے، اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل حزب اللہ نے شام کی حکومت کو محفوظ رکھا ہے، القاعدہ اور داعش کے خلاف جنگ میں اسد کی موجودگی کو یقینی بنایا، ہتھیاروں کی فراہمی کی اہم راستوں کو محفوظ بنایا اور زبردست فوجی مہارت حاصل کی، قلمون کے پہاڑیوں پر ایک بفرزون قائم کیا اور لبنان کی طویل مشرقی سرحد کو جہادیوں کے حملوں سے محفوظ بنایا، اس معاملے پر شیعہ کمیونٹی کو اکٹھا کیا، اسکی وجہ شام میں ایک مخالف سنی حکومت کا قیام کا خوف بھی ہوسکتا ہے۔ حزب نے شاندار کامیابیوں کی بھاری قیمت ادا کی ہے، اس تنظیم نے دشمنوں اور اتحادیوں کے ساتھ مل کر تنازعے کے فرقہ وارانہ پہلو کو ہوا دی، اس نے سنی جہادیوں کی بغاوت کو روکنے میں شام کی حکومت کی مدد کی ہے، جس نے حزب اللہ کو ایران کے علاقائی ایجنڈے کا اہم جز بنا دیا، ایران کے بجائے حزب اللہ اور لبنان کی شیعہ کمیونٹی جہادیوں کی آسان رسائی میں ہیں، جبکہ جنگ میں شامل ہوتے وقت تنظیم کا واضح مقصد انتہا پسند جہادیوں کو لبنان سے دور رکھنا بتایا گیا تھا، حقیقت میں شام میں مداخلت نے خطرے کو بڑھا دیا اور ان کو ۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۵ء کے درمیان مسلسل حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر لچکدار رویہ اپناتے ہوئے انہوں نے اسد کی شرائط تسلیم کرکے ہتھیار ڈالنے یا مرنے کے علاوہ باغیوں کے پاس کوئی راستہ نہیں چھوڑا، حزب اللہ اور اسکے اتحادیوں نے باغیوں کی قیادت کو ابھرنے نہیں دیا تاکہ وہ بات چیت کرکے مسئلہ حل کرنے کے قابل ہوسکیں، کیونکہ معاہدے کے کمی اسد حکومت کو برقرار رکھے گی، یہ حکومت کو بچانے کے لیے حزب اللہ اور دیگر شیعہ عسکریت پسند کی ضرورت بھی ہے، روس بھی اس بدنام حلقہ میں شامل ہے، حزب اللہ کی عسکری صلاحیتیں پہلے ہی دباؤ کا شکار ہیں اور شام میں مداخلت نے تنظیم کے مالی مسائل میں اضافہ کیا ہے، ایک اہم مسئلہ جنگجوؤں میں کمی بھی ہے، حزب اللہ ۱۵۰۰ رسے زائد جنگجوؤں کو کھو چکی ہے، ان میں تجربہ کار کمانڈرز بھی شامل ہیں جن کا متبادل ملنا مشکل ہیں، اس کے باوجود امکان ہے کہ تنظیم کو شام میں افرادی قوت کی فراہمی جاری رکھنا پڑے گی، اس صورتحال کو تبدیل کیے بغیر میدان جنگ میں مزید کامیابی کا امکان نہیں، دمشق او حمص میں ۲۰۱۷ء میں حکومت کی حامی فوج اور عوام پر ہونے والے مسلسل حملے شام میں نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی کو ظاہر کرنے کے ساتھ ۲۰۰۳ء کے بعد کے عراق کی یاد دلاتے ہیں، شام میں حزب اللہ کی مداخلت نے دمشق اور تہران میں اسکی اہمیت میں اضافہ کیا ہے مگر اس سے تنظیم دوسرے فریقوں کے لیے ناقابل قبول ہوگئی، شاید تنظیم کے لیے جنگ کی یہ سب سے بڑی قیمت ہے، ایک وقت تھا کہ حزب اللہ کو اسرائیل سے تنازعے کی وجہ سے اپنے ملک سمیت علاقائی سطح پر دوسرے فرقوں میں بھی مقبولیت حاصل تھی، جہادیوں کی تشدد کے خطرے سے یقینی طور پر لبنان کے شیعوں کی حمایت بڑھانے میں مددملتی ہے، خطے میں سنی اکثریتی ماحول بھی ایک وجہ ہے، حزب اللہ اور شیعہ کمیونٹی بظاہر عسکریت پسندی میں پھنسے رہیں گے۔ شیعہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی فوائد برقرار رکھنے کے لیے پارٹی کی عسکری طاقت پر انحصار کرتے ہیں، شام میں مداخلت سے حزب اللہ کو اضافی جنگی تجربہ اور سازوسامان حاصل ہوا ہے مگر خطے میں الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے ۲۰۰۶ء کے مقابلے میں حزب اللہ اسرائیل کے سامنے کمزور ہوگئی ہے، حزب اور اسرائیل کے درمیان مستقبل کی جنگ کو لبنانی سنی مسلمان اور شامی اپوزیشن ایک انتقام کے موقعے کے طور پر دیکھیں گے، جنگی میدان میں حاصل ہونے والی کامیابی کو سیاسی اثاثے میں تبدیل کرنے کے لیے حزب اللہ کو ایک کامیاب انخلا کی حکمت عملی کی ضرورت ہے، حالانکہ شام کے تنازعے کو حل کرنے کا کوئی آسان طریقہ موجود نہیں، شام کے تنازعے کو حل کرنے کے لیے پارٹی ایران کے ساتھ مل کر اہم اقدامات کرسکتی ہے، حزب اللہ کو فرقہ وارانہ جذبات میں کمی لانے کے ساتھ تہران کے ساتھ مل کر اپوزیشن کے تمام مسلح گروپوں کو تشدد پسند جنونی قرار دینا بند کر دینا چاہیے، یہ پالیسی جنگ بندی کرانے میں مدد کرے گی اور غیر جہادی گروپوں کے ساتھ بات چیت کی راہ ہموار ہوجائے گی جس سے اقتدار کی منتقلی کے مختلف طریقوں پر اتفاق کیا جاسکے گا، اس سے دمشق کے قریب سنی اکثریتی علاقے اور ادلب میں شیعہ اکثریتی علاقے میں ایک دوسرے پر حملے اور پابندیوں کی شدت کم ہوجائے گی۔ حزب اللہ اور ایران کو صدر اسد پر سیاسی مفاہمت کے لیے دباؤ ڈالنا چاہیے، انہیں اسد کو اپوزیشن کے علاقے میں نئے حملے کرنے سے باز رکھنا چاہیے، اس طرح کے حملے فرقہ وارانہ تقسیم کو مزید گہرا کردیں گے، اگر مسئلے کے حل کے لیے عسکری طاقت کا استعمال جاری رہا تو حزب اللہ کی قیادت مشکل میں پھنس سکتی ہے، ۲۰۰۰ء سال قبل اپیرس کے بادشاہ سے منسوب قول ہے (اگر ہم نے ایک اور جنگ جیت لی تو ہم مکمل طور پر تباہ ہوجائیں گے)۔

حزب اللہ نے ۲۰۱۳ء میں بنیادی طور اپنے بچاؤ کے لیے جنگجوؤں کو شام بھیجا تھا، اگر امریکا کے حمایت یافتہ علاقائی طاقتیں اسد حکومت کا خاتمہ کردیتی تو ان کو دمشق میں ایک مخالف سنی حکومت کا سامنا ہوتا اس طرح وہ ایران سے اسلحے کی فراہمی کے ضروری راستے سے محروم ہوجاتے، آج حکومت کی حفاظت کا بنیادی مقصد پورا ہوچکا ہے لیکن جنگ کا خاتمہ ہوتا نظر نہیں آتا، اگر ایران اور حزب اللہ جنگ کے خاتمے کی کسی حقیقت پسند حکمت عملی کے بغیر حکومت کی غیر مشروط حمایت جاری رکھیں گے تو عسکری طاقت کے باوجود مزید دلدل میں پھنس جائیں گے، انہیں ممکنہ طور پر زیادہ دشمن امریکی انتظامیہ کا سامنا ہوگا، کہا جاتا ہے کہ وہ ایرانی رسوخ کا خاتمہ چاہتے ہیں، حالانکہ وہ داعش کے خلاف زیادہ جارحانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں اور ان سب کا مشترکہ دشمن داعش ہے، دلدل میں پھنسنے سے بچنے کے لیے ایک سمجھوتے سوا کسی چیز کے ضرورت نہیں ہے، ایسا سمجھوتا جس میں روس کے ساتھ اپوزیشن کی حمایت کرنیوالے اہم ممالک شامل ہوں اور دمشق پر سمجھوتے کو نافذ کیا جائے۔ یہ رپورٹ اس حوالے سے ابتدائی اقدامات تجویز کرتی تاکہ ایران اور حزب اللہ کو اس سمت لے جایا جاسکے، اس میں غیر جہادی باغیوں کو تسلیم کرکے ان سے بات چیت شروع کرنا، فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنا، اپوزیشن کے زیر انتظام علاقوں میں حملے روکنا شامل ہے تاکہ جب بھی کسی معاہدے پر پہنچا جائے تو غیر جہادی حریف معاہدہ نافذ کرنے کی قابل ہو۔ ایران کی حمایت کے بغیر حزب اللہ شام کی صورتحال تبدیل نہیں کرسکتی اور اس وقت تک یہ شام میں مداخلت کی بھاری قیمت ادا کرتے رہیں نگے، لبنان میں اپنی عسکری طاقت کی حفاظت کے لیے سابق صدر حافظ اسد کی حکومت پر انحصار کرنا ان کے بیٹے کی

شام میں حکمرانی کی بقا کے لیے مدد کی وجہ بنا ہے، مگر اب اسد کے ساتھ اتحاد ایک بوجھ بن چکا ہے، یہ وسائل کے ضیاع، جہاد پسند گروپوں کو طاقتور بنانے کے ساتھ شامی عوام کی اکثریت اور خطے کے ممالک کو شکست دینے کی کوشش ہے، یہ اسرائیل کے خلاف کھڑی ہونی والی لبنانی تحریک مزاحمت کی شناخت کے لیے مزید نقصاندہ ہے، ۲۰۰۶ء میں لبنان جنگ کے دوران عربوں نے مشترکہ دشمن سے جنگ کی وجہ سے حزب اللہ کی تعریف کی مگر اب اسے ایک فرقہ پرست شیعہ عسکری تنظیم کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور شام میں تو اسے ایک بے رحم قابض تصور کیا جاتا ہے۔حزب اللہ نے شام میں مداخلت کا فائدہ اٹھایا ہے، اس کی پوری کوشش رہی کہ حکومت برقرار رہے اس طرح سے وہ ایران کی سب سے مضبوط اتحادی بن گئی اور اس جنگ نے دونوں کے تعلقات کو مزید مضبوط کر دیا، حزب اللہ نے اسرائیل سے مقابلے میں ایران کو اسٹریٹجک گہرائی دی ہے، شام میں حزب اللہ کے کردار نے اسے ایران کا ناگزیر اتحادی بنا دیا جس پر بہت کچھ داؤ پر لگا ہے، علاقائی تنازعات میں فرقہ پرستی کا رنگ گہرا ہو رہا ہے، جس کے اہم مراکز ایران اور سعودی عرب ہیں، ایران حزب اللہ کو اسلحہ اور دیگر معاونت فراہم کرتا ہے تاکہ وہ اسرائیل سے لڑے اور عسکری طاقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک پر اپنی سیاسی بالادستی قائم رکھے، اس بات سے شیعہ ہمیشہ انکار کرتے ہیں، حزب اللہ نے روس کے ساتھ تعلقات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، جس کے نتیجے میں 2015ء میں مداخلت کی گئی، یہ میدان میں اہم اتحادی ہیں، روس کی فضائی مدد کے بغیر لڑنے والی فوج غیر موثر ہو چکی ہوتی، اس فوجی اتحاد کے ذریعے تنظیم نے اپنی عسکری اور تکنیکی مہارت میں اضافہ کیا ہے، پہلی بار کسی عالمی طاقت کے ساتھ تعلقات قائم ہوئے ہیں، یہ تعلقات دباؤ کا شکار ہیں کیونکہ ماسکو ایک سیکولر طاقت کے طور پر ایک اسلامی انتہا پسند اور مضبوط شامی ریاست کی مدد کرنے میں محتاط ہے، ماسکو کا شام میں اپنا ایجنڈا ہے جو اب حکومت کا وجود یقینی بنانے کے بعد ایران اور حزب اللہ سے مختلف ہے۔حزب اللہ بھی اپنا ایجنڈا رکھتی ہے اس لیے اسے اپنی سیاسی حکمت عملی کی ضرورت ہے، دیگر کھلاڑیوں کے ساتھ یہ بھی عسکری طاقت کا استعمال جاری رکھے ہوئے ہیں، اس سے صرف تنازعے بڑھے گا اور انتہا پسندی میں اضافہ ہوگا، غیر جہادی باغیوں کی شکست سے اصل جہادیوں کو مدد ملے گی اور حقیقی حزب اختلاف کا خاتمہ ہو جائیگا، جس سے آپ بات چیت کر کے معاہدے پر عمل درآمد کرا سکتے ہیں، روس اور ایران کے مدد سے ۲۰۱۶ء میں حلب میں فتح حزب اللہ کے حوصلے بلند کر سکتی ہے اور زیادہ زمین حاصل کرنے کی کوششوں میں اضافہ ہو سکتا ہے، شورش کے دوران دشمن کے آبادی والے کسی علاقے پر قبضہ کرنا مہنگا پڑتا، خون اور پیسہ دونوں تیزی سے خرچ ہوتے ہیں، اسے روک کر پارٹی کو بچایا جا سکتا ہے، اس جال سے نکلنے کے لیے حزب اللہ کو ایران کے ساتھ مل کر کشیدگی کم کرنے کے لیے فوری طور پر اقدامات کرنے چاہیے، روس، ترکی اور ایران نے جنوری ۲۰۱۷ء میں آستانہ میں امن عمل کا آغاز کیا، انہیں ملک بھر میں جنگ بندی کرنے میں مدد کرنی چاہیے، انہیں غیر جہادی مخالفین کے ساتھ بات چیت کا راستہ کھولنا چاہیے تاکہ شام کو تقسیم کیے بغیر اپوزیشن کے زیر قبضہ علاقوں میں انتظامی معاملات چلائے جا سکیں، انہیں صدر اسد پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ وہ سیاسی حل کے لیے بات چیت کریں، نئے حملوں کر کے اجتماعی سزا دینے سے اجتناب کریں اور آبادیوں کے محاصرے ختم کر دیں، معاہدے کے بدلے میں پارٹی کے اہم مفادات ضرور حاصل کیے جائیں، اسکے لیے اپنی عسکری صلاحیت پر سمجھوتا کرنے کی بھی ضرورت نہیں، تنظیم اسلحہ سپلائی کے راستے محفوظ کرنے، شام میں شیعہ مزاروں کے حفاظت، لبنان میں شیعہ آبادی اور اپنے جنگجوؤں کے خلاف حملے کے روک تھام کے لیے اقدامات جاری رکھ سکتی ہے، اگرچہ مسلح حزب اللہ پر دنیا کے شدید تحفظات موجود ہیں مگر شام میں معاہدے کے لیے تنظیم کو غیر مسلح کرنے سے منسلک نہیں کیا جا سکتا ہے، حزب اللہ کو بھی لبنان میں مقامی مخالفین کے خدشات کو کم کرنے کے لیے کام کرنا چاہیے اور دفاعی حکمت عملی پر دوبارہ مذاکرات شروع کرنے چاہیے، شام میں مداخلت کے خاتمے کے ساتھ حزب اللہ کے ہتھیاروں کے استعمال کو ریگولیٹ کیا جا سکے گا، اس میں تنظیم کی جانب سے مقامی افراد کے خلاف ہتھیار کا استعمال نہ کرنے کا وعدہ اور اسرائیل کے خلاف اشتعال انگیزی نہ کرنے کا وعدہ بھی شامل ہے، اس میں سے کوئی کام بھی آسان نہیں ہے مگر دوسرا راستہ حزب اللہ اور خطے کے لیے اس سے بدتر ہے، یہ حزب اللہ کے لیے بھاری جانی نقصان کے ساتھ سب سے مہنگی اور ایک نہ جیتی جانے والی طویل جنگ ہے، حزب اللہ کو ہمیشہ شیعہ کمیونٹی میں متحرک رہنا ہے اور اس کے صبر اور حمایت کی بھی کوئی حد ہے، نئے بھرتی ہونے والے نوجوانوں میں عزم اور نظم وضبط کی بھی کمی ہے، نظم وضبط اور عزم نے ہی حزب اللہ کو مضبوط عسکری طاقت بنایا ہے، حزب اللہ ۱۹۸۲ء میں اسرائیل کے لبنان پر قبضے کی پیداوار ہے، فرقہ ورانہ کارڈ استعمال کیے بغیر لبنانی شیعوں میں تنظیم کی مقبولیت میں اضافہ ہوا، ۱۹۹۰ء میں خانہ جنگی کے اختتام پر تنظیم لبنانی نظام کے اندر سیاسی جماعت کا کردار ادا کرنے کے ساتھ اسرائیل کے خلاف مسلح اسلامی مزاحمتی تحریک کا کردار بھی ادا کر رہی تھی، ۲۰۱۱ء میں شام میں خانہ جنگی کے بعد حزب اللہ فرقہ ورانہ رنگ میں رنگ گئی، ایک ایسی لبنانی شیعہ تنظیم جو جس نے اپنی طاقت سرحد پار تک پھیلا دی ہو، اگرچہ ماضی میں بھی حزب اللہ لبنان سے باہر سرگرم رہ چکی ہے، جس میں شام، عراق اور یمن شامل ہیں، مگر ان ممالک میں حزب اللہ کی موجودگی کو ہمیشہ قیاس آرائی ہی سمجھا گیا، لبنانی مبصر کا کہنا ہے کہ ''میرے حزب اللہ کے دوستوں کے لیے شام اور یمن جیسے ممالک اہم ترین بن گئے ہیں اور لبنان انکے مباحثے میں ثانوی حیثیت اختیار کر گیا ہے''۔ شام ایک انتہائی اہم ملک ہے جہاں پہلے بار تنظیم کا مقابلہ عرب دشمن سے ہوا ہے، بغاوت کے ابتدا میں ہی حزب اللہ اور ایران نے واضح کر دیا تھا کہ وہ حکومت میں کوئی بنیادی تبدیلی قبول نہیں کریں گے، خاص طور پر سیکورٹی اور انٹیلی جنس کے محکموں میں، جس کے بعد اسٹریٹجک مفادات کے مطابق حزب اللہ کی عسکری سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا، آج تنظیم اور بشاالاسد کی حکومت کی قسمت کا انحصار ایران سے شام تک اسلحے کی فراہمی کے راستوں پر ہے، حزب اللہ دمشق سے اچھے تعلقات پر انحصار کرتی ہے اور تنظیم کی فوجی مدد اسد حکومت کے لیے بہت اہم ہے، شام میں بغاوت کے ابتدائی دنوں میں حزب اللہ کے حکام کہا کرتے تھے کہ ''انہوں نے حکومت کو تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کی اور مظاہرین کے جائز مطالبات پر غور کیا، مگر جب انکے مشورے کو نظر انداز کر دیا گیا تو انہوں نے حکومت کی عسکری اور لوجسٹک مدد کی، ۲۰۱۲ء کے آغاز میں پر امن بغاوت کے دوران مظاہرین کے خلاف سفاکانہ کریک ڈاؤن میں حکومت کا کردار کم نہیں تھا، جس کے بعد یہ بغاوت بیرونی مدد سے مکمل پراکسی جنگ میں تبدیل ہوگئی، اس کے بعد حزب اللہ اور ایرانی پاسداران انقلاب کے عسکری مشیر بڑی تعداد میں پہنچ گئے اور اپنے دعوے کے مطابق سنی جہادیوں سے حکومت کو بچانے کوشش کرنے لگے، پھر حکومت

کو برقرار رکھنے کے لیے تنظیم کا کردار اہمیت اختیار کر گیا، حزب اللہ نے فرقہ ورانہ جنگ کی پیش گوئی اپنے ہاتھوں پوری کی، تنظیم کو افرادی قوت میں کمی کا سامنا بھی کرنا پڑا، پیشگی دفاع کے لیے انتہاپسندی پر اکسانا ایک جعلی دعوی ہے، جب ملک کے اہم ترین علاقوں پر حکومتی گرفت کمزور ہوگئی تو ۲۰۱۳ء میں مکمل فوجی مداخلت کی گئی کیونکہ شکست تنظیم کی اپنی بقا کے لیے خطرہ تھا، حزب اللہ کے رہنما تسلیم کرتے تھے کہ یہ مداخلت شام اور عرب خطے میں تنظیم کی ساکھ اور جنگجوؤں کے لیے بہت زیادہ نقصاندہ ہوگئی، جنگجوؤں کی ہلاکتوں میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، مئی ۲۰۱۶ء میں حزب اللہ کے ایک رکن کے بقول ۱۷۰۰/ سے ۱۸۰۰/ جنگجوؤں شام میں ہلاک ہوچکے ہیں، انہوں نے دوست کھونے شروع کردئے ہیں، انہوں نے آبادی کے اہم حصوں کو بھی تقسیم کردیا، حزب اللہ پر عوامی بغاوت کے معاملے پر دوہرا معیار رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے، خاص طور پر تیونس، مصرم، لیبیا، بحرین اور یمن کے معاملے میں بغاوت کرنے والوں کی حمایت مگر شام میں بیرون سازش کے نام پر اسے کچل دینا، شام کی اپوزیشن کے ساتھ ان کی دشمنی زیادہ سخت ہے، تنظیم کے رہنما الزام لگاتے ہیں کہ مظاہرین اسرائیل، مغرب، ترکی اور خلیج کے مفادات کے لیے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں، شام کے اخوان المسلمین کے ساتھ بھی تعلقات کشیدہ ہیں، صرف اسلیے نہیں کہ اخوان مخالفت میں سرگرم ہے بلکہ اس کی وجہ حماس بھی ہے، اردن سے بیدخلی کے بعد فلسطینی اخوان المسلمین کا مرکزی دفتر ۱۹۹۹ء سے دمشق میں موجود تھا، عسکری فتح کے لیے تو ایران، روس اور حزب اللہ کی مداخلت کامیاب رہی، انہوں نے مل کر کمزور ترین حکومت کو برقرار رکھا، شام کے وسطی اور مغربی علاقوں کو محفوظ کرکے انہوں نے سرحد کے دونوں اطراف کامیاب بفرزون قائم کردیا، شام میں باغیوں کے علاقوں سے لبنان میں ہونے والے حملوں میں نمایاں کمی کردی، تنظیم نے ایران اور روس کی عسکری سرپرستی میں آپریشنل مہارت بھی حاصل کرلی، ان کی اہم عسکری مدد مستقبل کے مذاکرات میں سیاسی کردار میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے، یہ تبدیلی براہ راست اور ایران کے ذریعے ہوسکتی ہے، حکومت کی تبدیلی کے معاملے پر امریکا، ترکی، قطر اور سعودی عرب کا کردار خطے میں طاقت کا توازن تبدیل کرسکتا تھا، ان ممالک نے اپنی زیر سرپرست تنظیموں کو مضبوط کیا، شام میں مداخلت کے بعد حزب اللہ کی حکمت علی اور ساکھ میں بہت تبدیلی آچکی ہے، اسرائیل سے جنگ اور مظلوموں کے حفاظت کی روایتی شناخت ختم ہوچکی، اب تنظیم کا بنیادی مقصد سنی انتہاپسندوں سے لڑنا بن گیا ہے، اس سے قبل اسرائیل کے معاملے پر حزب اللہ مشترکہ ریلیف فورس تھی، لیکن خطے میں بڑھتی ہوئی تقسیم کے بعد آپریشن جاری رکھنے کے لیے حزب اللہ کا انحصار مکمل طور پر شیعہ کمیونٹی پر ہوگیا، بغیر کسی تفریق کے سارے شامی باغیوں کو تکفیری سمجھنا، اپنے لبنانی، شامی مخالفین کو مغربی اور اسرائیلی ایجنٹ بلانا، پھر کہنا ہے کہ یہ جنگ فرقہ ورانہ نہیں، یمن میں سعودی، مغربی اتحادیوں کے ہاتھوں ہونے والی شہری ہلاکتوں کی مذمت کرنا اور شام میں اسے نظرانداز کرنا، خاص طور پر شام میں بے رحم حکمت عملی اپنانا، آبادیوں کا محاصرہ کرکے انہیں بھوکا مرنے پر مجبور کرنا، اپنی جنگی اخلاقیات کے خود تعریف کرنا، اپنی روایتی ظالموں کا مقابلہ کرنے والی طاقت ہونے کی سوچ سے چمٹے رہنا، عجیب اور تضادات سے بھرا موقف ہے، حزب اللہ کو امید تھی کہ اس جنگ کو تکفیریوں کے خلاف لڑائی کے طور پر پیش کرکے دوسری حمایتیوں کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے پر قائل کرلے گی، اس طریقے سے اسد کو سنی جہادیوں کے خلاف اہم اتحادی کے طور پر پیش کیا جائے گا اور جنگ میں بین الاقوامی سطح پر اتحادیوں کی وسیع حمایت حاصل ہو جائیگی، خاص طور پر روس کی، حقیقت میں تنظیم کا ایجنڈا بہت وسیع ہے، حزب اللہ پورے شام میں پھیل چکی ہے، جہادی اور غیر جہادی عناصر کو ایک جیسا نقصان پہنچایا جارہا ہے تاکہ مذاکرات کی صورت میں بھی اپنے اتحادی کی برتری قائم رہے، اگرچہ حزب اللہ بار بار کہتی رہی ہے کہ وہ سیاسی حل کی حمایت کرتی ہے مگر تنظیم اور اسکے اتحادیوں نے حکومت کے مدد کرتے ہوئے پوری ڈھٹائی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فوجی طاقت کا استعمال کیا ہے تاکہ شکست خوردہ باغی حکومتی شرائط پر سمجھوتا کرنے پر مجبور ہوجائیں، اگر وہ اس پالیسی کو تبدیل نہیں کرتے تو یہ ایک خطرناک صورتحال ہے، اسطرح تو جن گروپس سے بات چیت کی جاتی ہے وہی بری طرح شکست کھاجائیں اور معاہدے کو نافذ کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوجائیں گے، اسطرح تو بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اپوزیشن کے باقی گروپس بھی جہادیوں میں شامل ہوسکتے ہیں، دوسری طرف اکثریتی آبادی نے حکومت کو مسترد کردیا ہے تو سوال اٹھاتا ہے کہ یہ حکومت کرنے کے قابل کیسے ہوں گے؟ حزب اللہ کے لیے اسکے ممکنہ نتائج بھی خطرناک ہیں، جنگ سے بہت زیادہ دباؤ پیدا ہوگیا ہے، حزب اللہ نے حکومت کی جنگی نااہلیت اور افرادی قوت کی کمی کو ہزاروں جنگجوؤں بھیج کر پورا کیا، اگرچہ پارٹی رہنما اس بات کو کم اہمیت دیتے ہیں مگر یہ حزب اللہ کے لیے سب بڑا چیلنج رہا ہے، ایک اندازے کے مطابق اسرائیل کے قبضے کے خلاف اٹھارہ سالہ جدوجہد میں تنظیم کے ۱۲۰۰/ جنگجوؤں ہلاک ہوئے، جبکہ اس جنگ میں انتہائی کم وقت میں بہت زیادہ ہلاکتیں ہوئی ہیں، اب تک ۱۷۰۰/ سے ۱۸۰۰/ جنگجوؤں ہلاک ہوچکے ہیں، تنظیم افرادی قوت کے مسئلے پر قابو پانے کے لیے لبنان کی شیعہ کمیونٹی میں بھرتی میں تیزی سے اضافہ کررہی ہے، وہ نئی بھرتی ہونے والوں کو پیسہ اور تربیت بھی فراہم کررہی ہے، پارٹی رہنما دعوی کرتے ہیں کہ ''اگر ہم شام میں سنی انتہاپسندوں سے نہ جنگ کریں تو ہمیں اپنے گھر میں یہ جنگ کرنا ہوگی، جبکہ ۲۰۱۳ء میں حزب اللہ کی شام میں عسکری مداخلت سے قبل لبنان میں وسیع پیمانے پر تشدد پھیلا ہوا تھا، جسے بیرونی مدد بھی حاصل تھی، بہرحال حسن نصراللہ کا یہ نقطہ نظر جلد ہی غلط ثابت ہوگیا جب حزب اللہ کی مداخلت کے جواب میں شامی خودکش حملہ آوروں نے لبنانی شیعوں کو نشانہ بنایا، جولائی ۲۰۱۳ء میں بیروت میں شیعہ اکثریتی علاقے میں کار بم دھماکا ہوا جس میں ۵۳/ افراد زخمی ہوئے، جبکہ اگلے مہینے ہونے والے خودکش حملے میں ۱۵/ افراد ہلاک اور ۲۰۰ سے زائد زخمی ہوئے، یہ واقعات حزب اللہ کو اپنا کردار تبدیل کرنے پر مجبور کرتے ہیں، شروع میں تو عوامی سطح پر تسلیم ہی نہیں کیا گیا تھا کہ تنظیم کے جنگجو شام میں موجود ہیں، جانی نقصان کے بعد ہلاکتوں کے اعلان کے لیے ایک غیر واضح اصطلاح استعمال کی جاتی تھی کہ ''جہاد فرض ہے''۔ اس سے جنگجوؤں کے کردار کی تعریف شروع ہوجاتی اور جنگ کے لیے مقبول حمایت میں مزید اضافہ ہوجاتا، تنظیم کو افرادی قوت کے مسئلے پر قابو پانے کے لیے زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت کی ضرورت بھی ہے، تنظیم نے نئے بھرتی ہونے والے جنگجوؤں کے لیے تربیت کا معیار بھی ختم کردیا ہے، ایک معاہدے پر نوکری اور پھر مختصر تربیت کے بعد لمبے عرصے کے لیے محاذ جنگ کے لیے روانگی، شام میں جنگ کرنیوالے شیعہ نوجوان تازہ دم ہونے کے لیے لبنان لوٹتے ہیں اور عام زندگی گزارتے ہیں، جنگجوؤں کے پاس لڑائی میں شامل ہونے کی کئی وجوہات ہیں، کچھ لوگوں کے لیے مالی مقاصد اہم ہوتے ہیں لیکن

زیادہ تر کے نزدیک فرقہ واریت میں اضافہ اور سنی جہادیوں کا خوف سب سے اہم وجہ ہے، ایک ایسا ملک جہاں ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضرورت پوری کرنے، بہتر مستقبل اور وقار کا احساس فراہم کرنے میں ناکام ہے، وہاں شام میں جہادیوں سے لڑنا بڑا مقصد فراہم کرتا ہے، ۲۰۱۳ء میں حزب اللہ میں شامل ہونے والے جنگجو کا کہنا ہے کہ ''حزب اللہ میں شامل ہونے سے قبل میری زندگی بے مقصد تھی، جب سے میں تنظیم میں شامل ہوا، میرے پاس لڑنے کا ایک مقصد ہے، میں نے اپنی کمیونٹی میں عزت اور اہم مقام حاصل کیا ہے، میں اپنی سماجی اور فوجی فرائض ادا کرنے کے ساتھ مذہبی ذمہ داری بھی ادا کر کے اپنے لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں''۔حزب اللہ نے اس کو منافع بخش بنادیا ہے، نئے بھرتی ہونیوالے جنگجوؤں کو تنظیم سے تعلق کا بہتر احساس اور مالی انعام دیا جاتا ہے، جنگ میں مرنے کے صورت میں یہ سب انکے خاندان کے لیے ہے، پارٹی کی ہدایت کے تحت شیعہ کمیونٹی شہدا کو خراج تحسین پیش کرتی ہے اور انکے خاندانوں کو جذباتی اور مادی مدد فراہم کرتی ہے، شہدا کی ماں کو خاص عزت دی جاتی ہے، اس طرح کی سماجی اور مذہبی رسموں سے جنگجوؤں کے خاندانوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں تیزی سے فرقہ واریت میں اضافہ ہو رہا ہے اور اپنے بچوں کی قربانی دینے کے لیے دوسرے خاندانوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، لبنانی شیعوں کی اکثریت تاحال تنظیم کے پیچھے پوری مضبوطی کے ساتھ کھڑی ہے، شام میں بڑھتے ہوئے تشدد کا ایندھن بننے کے بعد شکست کی آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں، جو تنظیم کی فوجی ہنر مندی اور جنگجوؤں کی فتح کے ساتھ جلد گھر واپسی پر سوال کر رہی ہیں، مئی ۲۰۱۶ء میں قالامون کے علاقے میں حزب اللہ کی فتح کے بیان پر بھی شک کا اظہار کیا جارہا ہے، پارٹی سے تعلق رکھنے والے ایک یونیورسٹی پروفیسر کا کہنا ہے کہ ''حالیہ دنوں میں انہوں نے بہت سارے اسٹرائیجک فوائد حاصل کیے ہیں جس میں سے ایک حیران کن ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی پہلی جگہ پر اسٹرائیجک حیثیت کو کھو دیا ہے''اسرائیل کے ساتھ مقابلے کا پرکشش ماضی رکھنے کی وجہ سے حامیوں میں موجود بے چینی اعلی قیادت سے چھپی ہوئی نہیں، ایک جنگجو کا کہنا ہے کہ ''میں یقینی طور پر اسرائیل کے ساتھ جنگ کرنا چاہتا ہوں نہ کہ ایک ایسے تنازعے میں پڑنا جو عرب دنیا کو تقسیم کردے''فوجی تحرک بھی تنظیم کو سماجی طریقے کو نرم کرنے پر مجبور کرتا ہے، اسرائیل کے خلاف لڑنے والے ایک سابق جنگجو کا کہنا ہے کہ ''پہلے ہماری نسل جنگ میں جانے سے قبل ساری رات نماز ادا کیا کرتی تھی، آجکل آپ دیکھتے ہیں کہ شام جانے سے قبل لڑکے کیفے اور شیشہ پینے میں مصروف رہتے ہیں''بے شک حزب اللہ کی ساکھ کو سب سے زیادہ نقصان فرقہ ورانہ کارڈ کھیلنے سے پہنچا ہے، یہ صورتحال حزب اللہ اور وسیع شیعہ کمیونٹی کے تعلقات خطرے میں ڈال سکتی ہے، حزب اللہ سے تعلق رکھنے والے ایک عراقی عالم کا کہنا ہے کہ ''شام میں جنگ کے لیے نوجوان لبنانی شیعوں کو کیا بات مجبور کر رہی ہے؟ بشار الاسد اور ایران کی خاطر لڑنے والے بہت کم ہوں گے، سیدہ زینب کا دمشق میں موجود مزار واحد وجہ ہے جو ان کو متحرک رکتی ہے، مگر طویل عرصے تک اس صورتحال کا برقرار رہنا خطرناک ہوسکتا ہے، ایک دن رہنما مذاکرات کی میز پر بیٹھ سکتے ہیں مگر فرقہ پرستی کی دراڑ کو بھرنا بہت مشکل ہوگا''۔حزب اللہ کی جانب سے شام کے دو سنی اکثریتی گاؤں کا محاصرہ کرنا ویسی ہی فرقہ ورانہ منطق ہے جیسے سنی باغیوں نے ادلب میں دو شیعہ اکثریتی گاؤں کا محاصرہ کر رکھا ہے، حزب اللہ اور سنی باغی دونوں نے مسلسل راکٹ بازی اور حملوں کے ذریعے ان گاؤں کے رہائشوں کو نشانہ بنایا، ستمبر ۲۰۱۵ء میں حزب اللہ اور حکومت مخالفین کے ساتھ ایک معاہدے پر پہنچی، معاہدے میں چار گاؤں میں امداد کی فراہمی اور زخمیوں کی انخلا پر اتفاق کیا گیا مگر دونوں جانب سے اس پر بار بار عملدرآمد روکا گیا، اگر ایران کی جانب سے فروغ دیے جانے والے شیعہ ازم کو دیکھا جائے تو حزب اللہ اور دیگر شیعہ عسکریت پسندوں کا تعلق مخالف مکتبہ فکر سے ہے، ایرانی شیعہ ازم کو اپنانے والوں کے پھیلاؤ کا اندازہ لگانا مشکل ہے، یہاں شکست کی وجوہات ہیں، شام میں شیعہ آبادی کا ایک فیصد سے بھی کم ہیں، یہاں شیعہ مذہبی طریقوں کو فروغ دینے کا بہت کم امکان ہے، جیسے عاشورہ کا منایا جانا، یہ واضح طور پر مسلک کی بنیاد پر اشتعال انگیزی کا باعث بنتی ہے، دمشق میں موجود ایک امدادی کارکن کا کہنا ہے''شیعہ مسلک اپنانے والوں کے حوالے سے سوال کا جواب دینا مشکل ہے مگر شیعوں کی جانب سے اپنی مذہبی رسومات کا اظہار کرنے کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے، ہم نے اس سے قبل شام میں کبھی عاشورہ کے اتنی زیادہ تقریبات نہیں دیکھی تھی، اگر آپ باب ٹوما (دمشق کے پڑوس میں موجود عیسائی آبادی) جائیں تو آپکو بڑی تعداد میں شیعوں کی مذہبی علامات نظر آئیں گی، یہاں تک کہ عیسائیوں نے شیعوں کی بڑی تعداد میں موجودگی کی شکایت بھی کی ہے''۔حکومت کے بہت سارے مخالفین کو یقین ہے کہ لبنانی شیعہ اکثریتی وادی باقا کے قریب واقع سنی اکثریتی سرحدی علاقے کو خالی رکھنا حزب اللہ کے طویل مدتی حکمت عملی ہے۔تاثر یہی ہے کہ حزب اللہ ابھی تک شام میں اپنے کردار کو پہنچنے والے نقصان کے حوالے سے کچھ سوچنا شروع نہیں ہوئی ہے، طویل مدتی جنگ کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے، تنظیم کے ایک سینئر رہنما کا کہنا ہے کہ ''ہم جب تک ضروری ہوا جنگ کرتے رہیں گے، اگر اسکا کا مطلب دس یا بیس سال ہیں تو ہم اسکے لیے تیار ہیں، ہمارے نوجوانوں کا حوصلہ بلند ہے، ویسے بھی ہمارے پاس متبادل کیا ہے؟'' بظاہر حزب اللہ نے ''صبر اور فتح کا انتخاب کیا''اکتوبر ۲۰۱۶ء میں عاشورہ کے لیے یہی اسکا نعرہ تھا، تنازع ختم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس پر سوچنے کا آغاز ابھی تک نہیں ہوا ہے، تنظیم کے ایک سینئر رہنما کا کہنا ہے کہ جنگجوؤں لبنان واپس لوٹ جائیں گے کیونکہ تنظیم کا خیال ہے کہ سیاسی سمجھوتا حکومت کو برقرار رکھے گا، اسطرح حزب اللہ اور ایران کے مفادات کو مستحکم رکھا جائے گا اور ویسے بھی سیاسی حل بہت دور ہے۔شام میں عوامی سطح پر حزب اللہ جو اکھیل رہی ہے، ایسے لوگ بھی ہیں جو اختلافات کے باجود اپنی سلامتی کے لیے حکومت کی حمایت کرنے پر مجبور ہیں، لبنان میں موجود شامی پناہ گزین (اکثریت سنی) سے تعلقات میں حزب اللہ نے تحمل کا مظاہرہ کیا ہے، اپنے زیر اثر علاقوں میں انکا استقبال کیا، ان کی سیاسی سرگرمیوں پر نظر رکھی، اپنے حامیوں اور پناہ گزینوں کے درمیان تصادم نہ ہونے کو یقینی بنایا، اپنی اچھی ساکھ کو فروغ دینے کے لیے حزب اللہ کی ساجیوں تنظیموں اور بلدیاتی اداروں میں کام کرنے عہدیداروں نے مل کر شیعہ اکثریتی علاقوں میں شامی پناہ گزینوں کی خدمت کی ہے، پارٹی کو یقین ہے کہ جنگ ختم ہوجانے کے بعد اس سے مستقبل میں ان کی حمایت میں اضافہ ہوگا، حزب اللہ اور اسکے اتحادیوں کو لبنان اور شام میں سنی جہادیوں کے خطرے کا سامنا ہے، پورا خطہ فرقہ ورانہ ناسور کی عکاسی کر رہا ہے، یہ سب سعودی عرب، ایران اور ترک حریفوں کے درمیان جاری ہے، یہ اس ناسور کو ٹھیک ہونے سے روکتا ہے۔

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

"Hizbollah's Pyrrhic Victories in Syria".
("crisisgroup.org". July 3, 2017)

| | |

روبوٹس: سہولت یا مسئلہ؟

ظفراللہ خان

بے روزگاری اس وقت عالمگیر سطح پر انتہائی سنگین مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ کسی خاص خطے یا طبقے تک محدود نہیں۔ محض پس ماندہ اور ترقی پذیر ہی نہیں، ترقی یافتہ ممالک بھی اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صنعتی اور تجارتی عمل میں مشینوں کا عمل دخل دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی شرح کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ صنعتی انقلاب نے بہت سے کاری گروں اور ہنرمندوں سے روزگار چھین کر مشینوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اس کے بعد جب کمپیوٹر کا دور آیا تو مزید لاکھوں، بلکہ کروڑوں افراد بے روزگار ہوئے۔ اردو اخبارات ہی کی مثال لیجیے۔ کاتب ہاتھ کی کاری گری سے اخبارات کی زینت بڑھایا کرتے تھے۔ کمپیوٹر آیا تو کمپوزنگ بھی مشین کے ذریعے ہونے لگی۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں کاتب بے روزگار ہو گئے۔ مصور اخبارات کے خصوصی ایڈیشنز اور جرائد کے سرورق کے لیے تصاویر بنایا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ بہت خوبصورت تھا مگر جب کمپیوٹر آیا تو ان سب کی روزی روٹی جاتی رہی۔ کمپیوٹر نے اخبارات و جرائد تیار کرنے کی لاگت بہت کم کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمپیوٹر کے کام میں وہ خوبصورتی نہیں مگر سرمایہ کار تو اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ آجر کو اس بات سے کیا غرض کہ اس کی مصنوعات کا معیار کیا ہے۔ اگر خوبصورتی متاثر ہو رہی ہے تو اس کی بلا جانے۔ وہ تو لاگت میں واقع ہونے والی کمی اور اپنے منافع میں رونما ہونے والے اضافے کو اہمیت دے گا اور دے رہا ہے۔

بہت سے کاتبوں نے وقت کی نزاکت سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو مشینوں کا عادی بنا لیا۔ وہ کمپیوٹر سے جڑ گئے اور اب تک اپنا روزگار بچائے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے وقت کو سمجھنے میں دیر یا کوتاہی کی وہ بے روزگار ہو گئے۔

اب روبوٹ آ گئے ہیں تو کئی شعبوں میں لاکھوں، کروڑوں افراد کا روزگار داؤ پر لگ گیا ہے۔ بہت سے صنعتی اداروں میں روبوٹ کا استعمال پریشان کن حد تک بڑھ گیا ہے۔ بات پھر وہی لاگت میں کمی اور سہولت کی آ گئی۔ آجر چاہتے ہیں کہ ان کے یونٹس میں پیداواری عمل ہر صورت جاری رہے۔ انسان کام کرتے ہیں تو نخرے بھی دکھاتے ہیں اور غلطی بھی کر جاتے ہیں۔ روبوٹ تنگ کرتے ہیں، نہ دیر سے آتے ہیں اور نہ ہی ان کے کام میں عموماً کوئی بڑی کھوٹ ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں روبوٹ کا صنعتی ہی نہیں، گھریلو استعمال بھی نمایاں طور پر بڑھتا جا رہا ہے۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام روبوٹس کی مدد سے کیے جا رہے ہیں۔ گھریلو خادم کی حیثیت سے روبوٹ اس قدر عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اپنے گھروں میں مشینی خادم رکھنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ انسان کو خدمت کے لیے رکھا جائے تو وہ چھٹی بھی مانگتا ہے، کام میں ڈنڈی بھی مارتا ہے اور کام کا معیار بھی یکساں نہیں ہوتا۔ روبوٹ کبھی تھک کر بیٹھتا ہے نہ چھٹی مانگتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کام کہا جائے وہ ضرور کرتا ہے۔

جب تک انسان رب کائنات کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا رہتا ہے تب تک وہ زمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت سے اپنا کام بخوبی کرتا ہے اور مگر جب وہ اپنے نفس کا بندہ بن کر دوسروں کے استحصال پر بضد ہوتا ہے تب رب کے بتائے ہوئے اصولوں کو بالائے طاقت رکھ کر صرف زیادہ سے زیادہ منافع کی فکر لاحق رہتی ہے۔ ایسے میں وہ اشرف المخلوق کا درجہ کھو کر اسفل السافلین کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ لالچ انسان کو بصیرت سے محروم کر دیتا ہے۔ جب انسان کے ذہن پر لالچ سوار ہو جاتا ہے تب اس کا شعور ہوس اور تنگ نظری کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ جو انسان ایک کے دو، دو کے چار اور چار کے آٹھ کرنے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے وہ صرف اپنے مفاد کو ذہن نشین رکھتا ہے اور دوسروں کا فائدہ یکسر بھول جاتا ہے۔ ایسے میں معاشرے اور انسانیت کا تقدس اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

آج کا انسان بہت سے کام روبوٹ سے کرانا چاہتا ہے۔ جہاں انسانوں کو کام کے دوران بہت سے خطرات لاحق ہوں وہاں روبوٹ کو استعمال کرنا قرین عقل و دانش ہے۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ روبوٹ کے استعمال سے کتنے لوگ بے روزگار ہوں گے اور اس کا معاشرے پر کس حد تک منفی اثر مرتب ہوگا۔ کاروباری مفادات اپنی جگہ، صنعتی عمل کو زیادہ آسان اور منافع بخش بنانا اپنی جگہ مگر یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ ہر شعبے میں بیشتر کام روبوٹس کے حوالے سے پورے معاشرے کے مفاد ہی کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ صنعت کاروں نے صرف اپنی تجوری کو زیادہ سے زیادہ بھرنے پر توجہ مرکوز کی ہے جو کسی بھی اعتبار سے عقل مندی کا سودا نہیں۔

ہر شعبے میں روبوٹس کا استعمال بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک تو اب ریسٹورنٹس نے ویٹرز کے طور پر بھی روبوٹس سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ بچانا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے بے روزگاری بم کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور کسی بھی وقت کوئی بہت بڑا سیاسی و سماجی دھماکا ہو جائے گا۔ اب ایسی کاریں بھی تیار کی جا رہی ہیں، جو انسانوں کے بغیر یعنی خود بخود چلا کریں گی۔ چند ایک معاملات میں روبوٹس کو اساتذہ کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا گیا ہے۔ بہت جلد دھوبی کی دکان پر روبوٹ کپڑوں کو پریس کرتے بھی ملیں گے۔ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کے ماہرین ایک ایسا روبوٹ بنا چکے ہیں، جو صفائی کے ساتھ تولیہ، جینز اور ٹی شرٹ سلیقے سے تہہ کر سکتا ہے۔ ۲۰۱۰ء تک روبوٹ ایک تولیے کو اٹھانے، معائنہ کرنے اور تہہ کرنے میں ۱۹ منٹ لیتا تھا۔ ۲۰۱۲ء میں روبوٹ جینز کی جوڑی کو پانچ منٹ اور ٹی شرٹ کو ٦ منٹ میں تہہ کر سکتا تھا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ۲۰۲۱ء تک لانڈریز میں روبوٹ کپڑوں کو پریس اور تہہ کرتے ہوئے ملیں گے۔ ۲۰۲۷ء تک ٹرک کی سیٹ پر ڈرائیور کی حیثیت سے روبوٹ بیٹھے ہوئے ملیں گے۔ ۲۰۳۱ء تک بیشتر چھوٹی موٹی ملازمتیں روبوٹس سنبھال چکے ہوں گے۔ ۲۰۴۹ء تک ایسے روبوٹس مارکیٹ میں آ چکے ہوں گے جو دی ہوئی معلومات کی بنیاد پر خوب اچھی طرح سوچ کر لکھنے کی اہلیت کے بھی حامل ہوں گے۔ روبوٹس کے حوالے سے ٹیکنالوجی کا گراف بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ۲۰۵۳ء تک بیشتر اسپتالوں میں روبوٹس سرجن کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہوں گے۔

انسان نے فطری علوم و فنون کے حوالے سے جو ترقی کی ہے، وہ گزرے ہوئے زمانوں کے انسان دیکھ پائیں تو جادو سمجھ کر ڈر جائیں اور آج کی ایجادات کے سامنے سربسجود ہوں۔ ایک صدی پہلے تک جن تصورات کا کھل کر تمسخر اڑایا جاتا تھا وہ آج حقیقت بن کر ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ آج سے ایک صدی پہلے سائنس کی آج کی ایجادات کے بارے میں تصور کرنا بھی مضحکہ خیز سمجھا جاتا تھا۔ کس نے سوچا تھا کہ محض ایک صدی میں تصویر لینا ہی نہیں، انسان کی حرکات و سکنات کو بھی جوں کا توں محفوظ کرنا اور اسے جب جی چاہے تب دیکھنا انتہائی آسان ہو جائے گا۔ ٹیلی ویژن بیسویں صدی کی پیداوار ہے مگر اس حوالے سے بھی کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ بیک وقت ڈھائی تین سو یا اس سے بھی زائد چینل دیکھنا انتہائی آسان ہو جائے گا۔ ٹیلی کام سیکٹر کی ترقی جادو سے کم ہے کیا! آج دو افراد ایک دوسرے سے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر ہوں تب بھی با آسانی بات کر سکتے ہیں۔ اور وہ بھی انتہائی کم خرچ پر۔

باقی صفحہ نمبر ۱۱